تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبر قرآن وحدیث

مجلسِ ترتیب:

—— خالد مسعود (مدیر)
—— عبداللہ غلام احمد
—— ماجد خاور
—— محبوب سبحانی

ناشر : —— ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، رحمن آباد، لاہور-۲۵
مطبع : —— المطبعة العربية- لاهور
قیمت : ۴/۰ روپے

تدبر

سلسلہ نمبر ۱۳ جمادی الاول ۱۴۰۵ھ فروری ۱۹۸۵ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ
قومی عہد کی پاسداری ——— خالد مسعود ۳
تدبرِ قرآن
تفسیر سورۂ آلِ عمران (۲) ——— خالد مسعود ۶
افاداتِ فراہی
احکامِ رسول کا قرآن مجید سے استنباط ——— خالد مسعود ۱۱
تزکیۂ نفس
آدمی کا تعلق ———
کنبہ، خاندان، معاشرہ اور ریاست سے ——— امین احسن اصلاحی ۲۱
تاریخ و سیر
اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی ——— امین احسن اصلاحی ۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

قومی عہد کی پاسداری

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار اور ارادہ سے مشرف کیا ہے۔ اس کو زبان عطا کی ہے جو اس کے دل کے عزم و ارادہ کی ترجمانی کرتی ہے اور اعضاء و جوارح دیے ہیں جو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق اس کے ارادوں کو ایک عملی حقیقت بنا دیتے ہیں۔ اپنے اس شرف کا قدردان انسان اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کر کے اچھے مقاصد کے لیے تگ و دو کرتا اور ان کی تکمیل کے لیے عمل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ وہ اپنی زبان سے جو بات نکالتا ہے وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل کے ارادے کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ ہر قیمت پر اس کی لاج رکھتا ہے اور اس کا عمل اس کے قول کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

خداوند تعالیٰ سراپا حق اور وعدے ایفا کرنے والا ہے۔ یہ صفاتِ یزدانی اس کے حقیقی بندوں میں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسلامی کردار کی تشکیل میں صداقت شعاری اور ایفائے عہد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایمان و تقویٰ کے ثمرات ہیں۔ قرآن مجید نے مومنین کو فلاح کی بشارت دیتے ہوئے ان کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ امانتوں اور وعدوں کا لحاظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ متقین کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ قول کے پکے ہوتے ہیں اور جب کوئی وعدہ کر لیتے ہیں تو اس کو ہر قیمت پر وفا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہوتے ہوئے جھوٹ بولے یا وعدہ کر کے اسے نبھائے نہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کے نفاق کی علامت بتایا ہے۔ اعلیٰ کردار کے منافی اس خصلت سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس طرح کی ہدایات دی ہیں کہ سچائی کو اختیار کرو اور وعدہ کو ایفا کرو کیونکہ ہر وعدہ کی بابت خدا کے ہاں پرسش ہونے والی ہے۔

یوں تو عملی زندگی میں عہد کی پاسداری ہمیشہ مطلوب ہے لیکن بعض شکلوں میں اس کی ضرورت و اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک انفرادی وعدہ کی نسبت ایک اجتماعی وعدہ بڑی قوت رکھتا

اور پورے معاشرہ کے لائحۂ عمل کو متعین کرتا ہے، لہٰذا اس سے وفا یا بے وفائی اجتماعی زندگی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح ایک عام آدمی کی نسبت ایک حکمران کا وعدہ بڑے ہی دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس کا دائرہ اثر بڑا وسیع ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ کیے گئے وعدہ کی نسبت خدا کے ساتھ کیے گئے وعدہ میں تقدس اور سنگینی کا پہلو بھی آجاتا ہے۔ خدا اپنے بندوں کے ظاہر و باطن پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کا علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ خود کبھی وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا لہٰذا وہ یہ چاہتا ہے کہ بندے بھی اس کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو مذاق نہ بنالیں۔ اگر وہ اس کے ساتھ وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ اس پر بڑی سخت گرفت کرتا ہے۔ اس لیے بندوں کے لیے محفوظ و مامون راستہ یہ ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو سنجیدگی کے ساتھ ادا کریں جو خدا کے ساتھ کیے گئے وعدوں سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ ورنہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جو وعدوں کے تار و پود بکھیر دینے والی اقوام کا ہوا۔

ہماری قومی زندگی شاہد ہے کہ ہم نے متعدد وعدے ایسے کیے جو قومی و اجتماعی نوعیت کے تھے، ان میں خداوند تعالیٰ کو فریق بنایا گیا تھا اور یہ حکمرانوں کی زبانوں پر بھی جاری رہے۔ تحریک پاکستان کے معاشی عوامل سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ عوامل بالآخر بالکل پس منظر میں چلے گئے اور جس نعرہ نے قوم کے ایک ایک فرد کو گرمایا اور اس کو یک جہتی کے ساتھ ایک نصب العین پر لگایا وہ مقبول نعرہ 'پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الا اللہ' ہی تھا۔ یہ محض نعرہ نہ تھا بلکہ اس میں مجوزہ ریاست پاکستان کو اسلام کے نظام حکومت کے تابع رکھنے اور معاشرہ میں اسلامی تعلیمات و روایات کو رواج دینے کا برملا عزم تھا۔ گویا یہ ایک اجتماعی وعدہ تھا جس میں خداوند تعالیٰ کو بھی فریق بنایا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد مارچ ۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے جب قرارداد مقاصد منظور کی تو یہ اسی مذکورہ عزم کا اثبات تھا۔ گویا قوم کے اجتماعی وعدہ کی تائید اولوالامر اور ارباب حل و عقد کی زبانوں سے ہوئی۔

یہ افسوسناک حقیقت ہماری تاریخ کا حصہ ہے کہ ہم نے اپنے ان اجتماعی وعدوں کے ایفا کے لیے کوئی اقدام نہ کیا ان کی بازگشت سنائی دیتی رہی لیکن ہمارے عمل نے کبھی یہ گواہی نہ دی کہ ہم اپنے وعدے میں مخلص تھے۔ زندگی کی جن راہوں پر ہم چلتے رہے انھوں نے بالآخر ہماری منزل ہی غائب کردی۔ ہماری اس غفلت کے نتیجہ میں وہ وقت بھی آپہنچا جب قوم کے ایک بڑے حصہ نے اسلامی نظام کے بجائے سوشلسٹ نظام کو اپنانے کا ارادہ کرلیا اور اس کے لیے زمین ہموار کرنی شروع کردی۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے دوسرے حصہ نے تحریک نظام مصطفیٰ کے نام سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے قائدین کے ذہنی تحفظات خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن قوم نے اس کا ساتھ دیا تو اس توقع پر کہ وہ ان کی منزلِ گم گشتہ کی جانب پھر سے سفر کا آغاز کریں گے، گویا یہ محض ایک سیاسی

تحریک نہ تھی بلکہ اس میں ایک قومی نصب العین کی طرف پیش قدمی تھی، ایک اجتماعی عزم کی نمود تھی اور نئے حکمرانوں نے اس تحریک کے تسلسل میں اپنے کو شریک کرکے ایک قومی وعدے میں خدا کو پھر ایک فریق بنایا۔ اگرچہ اس وعدہ کی بازگشت حسب سابق سنائی دیتی رہی لیکن ان کی اصلاحات کے نتیجہ میں جتنا کچھ اسلام ملک میں نافذ ہوا اور عملی زندگی جتنی اس سے متاثر ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔

۱۹ دسمبر ۸۴ء کو قوم نے پھر ایک اجتماعی وعدہ کیا جب ریفرینڈم میں یہ رائے دی کہ وہ حکومت وقت کی اس لیے تائید کرتے ہیں کہ وہ قوم کے ساتھ کیے گئے اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدہ کو پورا کرسکے۔ ظاہر ہے کہ قوم کا یہ عزم اور صدر پاکستان پر اعتماد کا اظہار اس لیے ہے کہ وہ عملی شکل میں اسلام کو ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں، ایک ایسی شکل جس میں قوم اسلامی نظام کا وجود محسوس کرے اور اس کی برکات سے مستفید ہوسکے۔

عزم اور ارادے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا، صرف الفاظ دہرانے سے پورے نہیں ہوتے۔ عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ عزم و ارادہ کرنے والا کیا واقعی صداقت شعار تھا یا نہیں اور عزم و ارادہ دل کی گہرائیوں سے ابھرا تھا یا یہ محض ظاہر کی ملمع سازی تھی۔ اب تک ہمارا قومی المیہ یہ رہا ہے کہ زبان کے اقرار کو ہم عمل میں لانے کے لیے سنجیدہ نہیں ہوتے اس کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں نہ غور و تدبر اور محنت و ایثار کو اپنا لائحہ عمل بناتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ صرف ہم قوموں کی برادری میں ایک اضحوکہ بن جاتے ہیں بلکہ خدا کے مجرم بھی قرار پاتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک قومی روش ہے جس کے نتائج ہمیں ذلیل و رسوا کرسکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس صورت حال کی اصلاح کی فکر کریں۔ ریفرینڈم میں ظاہر کیے گئے عزم کو سنجیدگی سے عملی جامہ پہنانے کے لیے اقدامات کریں۔ اسی طرح حکومت بھی قومی اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے اور اس مقصد سے غفلت نہ کرے جس کی تکمیل کے لیے قوم نے اس کو اعتماد دیا۔

تدبرِ قرآن
خالد مسعود

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۲)

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ عطا ہوا[۲۲]، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے[۲۳]۔ پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے[۲۴]۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہوگی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۵

دعا کرو[۲۵]، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز

---

[۲۲] کتابِ الٰہی کا ایک حصہ سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور آگے اللہ کی کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں نسبت جزاور کل کی ہے۔

[۲۳] یعنی اہلِ کتاب کے پیدا کیے ہوئے اختلافات کا فیصلہ کرکے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔

[۲۴] بنی اسرائیل کی اس جھوٹی آرزو کا تذکرہ بقرہ آیت ۸۰ میں بھی ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں۔

[۲۵] یہ دعا درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امت مسلمہ کے امامت و سیادت کے منصب پر فائز ہونے کی بشارت ہے۔ دعائیہ اسلوب اختیار کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ مستقبل کے حالات ابھی پردے میں تھے۔ دوسری یہ کہ امت مسلمہ اس بشارت کو فخر و غرور کے ساتھ قبول نہ کرے بلکہ تواضع، تذلل، احساسِ عبدیت اور دعا کے ساتھ قبول کرے۔

پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے[۲۶] اور تو جس کو چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۷

اہلِ ایمان[۲۷] مومنوں کے برخلاف کافروں[۲۸] کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے[۲۹]، اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہوگی اس کو بھی موجود پائے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اس کے اور اس کے درمیان ایک زمانۂ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمہیں ہوشیار کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے[۳۰]۔ ۳۰

کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا[۳۱] اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ

---

[۲۶] کائنات کے نظامِ تکوینی کی شہادت یہ ہے کہ مادیات اور معنویات دونوں میں موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورتِ حال اب بنی اسرائیل کی موت اور بنی اسماعیل کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔

[۲۷] اہلِ ایمان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں غیر مطمئن ہونے کے باعث یہود کی طرف میلان رکھتے تھے۔

[۲۸] کافروں سے مراد یہاں اہلِ کتاب خاص طور پر یہود ہیں۔

[۲۹] یعنی اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ اللہ سے دوستی کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے دشمنوں سے اپنا دامن بچا کے رکھو۔

[۳۰] یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر نہایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے وہ ان کو اپنی ذات سے بار بار ہوشیار کرتا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ وہ جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہوگی۔

[۳۱] یہ مذہب مسلمانوں کو صحیح رویے کی تعلیم دی ہے۔ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے۔ اس محبت کا راستہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ موالات نہیں بلکہ رسول کی پیروی ہے۔ یہی راستہ خدا کی محبوبیت کا بھی ہے۔

کافروں کو دوست نہیں رکھتا ۞ ۳۲

اللہ[۳۳] نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[۳۴] کو اہلِ عالم کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۞ ۳۴

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا[۳۵]، سو تو اس کو میری طرف سے قبول فرما، بے شک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے ۞ تو جب اس نے اس کو جنا تو اس نے کہا کہ اے رب یہ تو میں لڑکی جنی ہوں ——— اور اللہ کو خوب پتا تھا اس چیز کا جو وہ جنی تھی[۳۶] ——— اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ۞ تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا، اس کو عمدہ طریقے پر پروان چڑھایا اور زکریاؑ[۳۷] کو اس کا سرپرست بنایا۔

---

۳۲ یعنی جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت سے اعراض کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔

۳۳ یہاں سے آگے نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے۔ اس کا آغاز حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کی ولادت کے تذکرہ سے کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ماں بیٹا کوئی مافوق بشر ہستی نہیں تھے بلکہ اس مبارک خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد و ہدایت کے لیے برگزیدگی کا شرف حاصل ہوا تھا۔

۳۴ عمران بن ماثان حضرت مریمؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔ ان کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی والدہ اور نانا اور دوسرے اجداد معلوم ہیں تو ان کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دینے کے کیا معنی؟

۳۵ یعنی اس بچے پر بڑے ہو کر گھر در کی ذمہ داری نہ ہوگی، یہ بیت المقدس کی خدمت ہی کے لیے وقف ہوگا۔ جس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا کی عبادت و اطاعت کے لیے وقف ہو چکی تھی، یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ اس کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا گیا۔

۳۶ والدہ مریم کے دل میں نومولود کے بارے میں ایک کمتری کا احساس تھا۔ اس جملہ معترضہ میں اس کو ختم کیا ہے۔ مطلب یہ کہ اس لڑکی کی عظمت و برکت کو خدا خوب جانتا تھا۔

۳۷ حضرت زکریاؑ بیت المقدس کے کاہنِ اعظم ہونے کے علاوہ حضرت مریمؑ کے خالو بھی تھے۔

جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا وہاں رزق پاتا[۳۸]۔ اس نے پوچھا اے مریم یہ چیزیں تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب فضل فرماتا ہے ۞ ۳۷

اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! تو مجھے بھی اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے ۞ تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے۔ جو اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق[۳۹]، سردار[۴۰]، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش[۴۱] اور زمرۂ صالحین سے نبی ہوں گے ۞ اس نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے[۴۲]؟ فرمایا، اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۞ اس نے کہا اے میرے رب تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کیجیو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیجیو[۴۳] ۞ ۴۱

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا، تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا کی عورتوں پر ترجیح دی[۴۴]۔

---

۳۸ رزق سے یہاں مراد حکمت و معرفت ہے۔ وحی و ہدایت کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف ہے اسی لیے جب حضرت مریم کا کمال ان کی عمر کے لحاظ سے بہت زیادہ معلوم ہوتا تو وہ بطور استعجاب و تحسین پوچھتے کہ یہ علم و معرفت تمہیں کہاں سے حاصل ہوتا ہے؟ اسی سے ان کے اندر تمنا پیدا ہوئی کہ ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔

۳۹ اللہ کے کلمہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کُن' سے ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ ان کی تصدیق بھی کریں گے اور ان کی بشارت بھی دیں گے۔ حضرت یحییٰ کی ولادت کا یہ ذکر آگے آنے والے اس مضمون کی تمہید ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی تردید ہے۔

۴۰ نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ حضرت یحییٰ ایک بااختیار کی طرح بات کرتے تھے اور انھوں نے وقت کے حکمران کو بھی سخت سرزنش کی۔

۴۱ حضرت یحییٰ کی زندگی بالکل درویشانہ تھی۔ زندگی کا یہ نمونہ انھوں نے یہود کا رخ موڑنے کے لیے اختیار کیا جن پر دنیا کی محبت بہت غالب آگئی تھی۔

۴۲ یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ بشارت کی تصریح کرانے کے لیے ہے۔

۴۳ تین شبانہ روز کے لیے آدمی پر ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ زبان سے کوئی دنیوی بات تو نہ کر سکے لیکن تسبیح و تہلیل کر سکے، صرف روحانی تصرف ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔

۴۴ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے حضرت مریم ہی کا انتخاب فرمایا اور ان کی تربیت فرمائی تاکہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کی اہل بن سکیں۔

اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری میں لگی رہو اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔ ۴۳

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم تو ان کے پاس موجود نہیں تھے، جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور تم اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے[۴۵] تھے۔ ۴۴

یاد کرو[۴۶] جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ذی وجاہت اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ ۴۵ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور ادھیڑ[۴۷] ہو کر بھی اور وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۴۶

وہ بولی کہ اے میرے پروردگار! میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا، اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے[۴۸]۔ ۴۷ اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب، حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا۔ ۴۸ اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے[۴۹] گا۔ چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں — میں تمہارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کے مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم[۵۰] سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں

---

۴۵ یہ آیت اثنائے کلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت رکھتی ہے۔ مریم کی کفالت کے بارے میں خدامِ ہیکل نے قرعہ اندازی کا جو طریقہ اختیار کیا یا اس سوال پر کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں، ان میں جو جھگڑا ہوا، اس کی اطلاع انجیل میں موجود نہیں۔ ان غیب کی باتوں کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ یہ معلومات حضورؐ کی رسالت کی دلیل ہوئیں۔

۴۶ یہاں سے آگے حضرت عیسیٰؑ کے باب میں حقیقتِ حال کا اظہار ہے اور مخاطب نصاریٰ ہیں جو ان کی الوہیت کے قائل تھے

۴۷ گہوارے میں بات کرنا حضرت مریمؑ کی پاک دامنی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا۔ ادھیڑ عمر کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی گہوارے کی بات بچوں کی سی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن و سال کی دانائی ہوگی۔ اس آیت نے انجیلوں کی اس روایت کی تردید بھی کر دی کہ حضرت عیسیٰؑ جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے

۴۸ یعنی اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اس حقیقت کو کلمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۹ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی۔ اس کو خود انہوں نے بھی اپنے حواریوں پر واضح کیا اور غیر بنی اسرائیل کی طرف تبلیغِ دین کے لیے جانے سے انہیں روکا۔

۵۰ معجزات میں ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ (اللہ کے حکم سے) کی قید لگی ہوئی ہے۔ اس سے نصاریٰ کے اس تصور کی تردید مقصود ہے جس کے تحت وہ ان معجزات کو حضرت عیسیٰؑ کے ذاتی کرشمے قرار دیتے تھے۔

(باقی صفحہ ۲ پر)

افاداتِ فراہی

خالد مسعود

احکامِ رسول کا قرآن مجید سے استنباط

یہ ایک مسلمہ امر ہے جس میں کوئی مسلمان شک نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات شریعت کے احکام کی ایک مستقل بنیاد ہیں، خواہ یہ قرآن سے مستنبط ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضورؐ کے دیے ہوئے احکام کتاب اللہ ہی سے مستنبط ہوتے تھے جیسا کہ متعدد احکام کے ضمن میں خود آپ نے تصریح فرمائی اور قرآن میں بھی اس پر نصوص موجود ہیں۔ لہٰذا ہمیں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق استنباط کی معرفت حاصل ہو جائے تو ہمیں یہ خیر و برکت اور حکمتوں سے مالا مال کرنے کا باعث ہوگی۔ ان برکات میں سے چند ایک کا ہم یہاں تذکرہ کرتے ہیں اور باقی کو تدبر کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

اولاً، جس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا اسی طرح حکمت اور اسرارِ شریعت کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل کر دی تاکہ ہم لوگ اجتہاد کے قابل ہوں، اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھیں اور ظاہری و باطنی دلائل سے استدلال کرنے والے ہوں۔ اس معاملہ میں بھی حضورؐ ہمارے امام اور ہادی ہیں۔ فرمایا:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ	اور ہم نے تم پر ذکر اتارا تاکہ تم کھول کر بیان کرو جو لوگوں کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور کریں۔

(نحل - ۴۵)

پس حضورؐ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تاکہ ہم پر تفکر و تدبر کا طریقہ واضح ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تدبر کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ رسول کریمؐ کی اقتدا کا بھی حکم دیا اور آپ کی یہ حیثیت خاص طور پر واضح فرما دی کہ آپ شریعت اور حکمت کی تعلیم دینے والے ہیں۔

ثانیاً، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کے مبیّن اور مفسر ہیں اس لیے شرائع و عقائد دونوں میں آپؐ کی تاویلات کا علم ایک مفسر کے لیے سب سے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جن مقامات پر حضورؐ نے قرآن کے دلالات سے استنباط فرمایا ہے اس کا علم ایک مفسر کے لیے کبریت احمر سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور اصول تاویل کا ایک حصہ ہے۔

ثالثاً، بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ امیوں کی قوم میں سے تھے اس لیے آپ کے ہاں دقتِ نظر نہیں پائی جاتی۔ آپؐ نے لوگوں کو مخاطب بھی ان کے فہم کے لحاظ ہی سے کیا جو لوگ نبیؐ کی ذات کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں وہ قرآن کے متعلق بھی سوءِ ظن میں مبتلا ہیں، وہ اس میں غور و فکر کی ضرورت بالکل نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ظاہر الفاظ پر ہی رک جاتے اور اس کی حکمتوں اور اسرار کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی رائے صریحاً باطل ہے اس لیے اگر ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استنباط کی مثالیں پیش کی جائیں تو ان کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوں۔

رابعاً، سلف اور ائمہ کے درمیان کتاب و سنت کے تطبیق کے بارے میں بڑا اختلاف ہے، انہوں نے اپنے مذہب کی صحت کی وجہ سے کتاب و سنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا اور باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں سے کسی ایک کو ترک نہیں کیا۔ لیکن تطبیق کے معاملہ میں ان کا اعتماد منضبط اصولوں کے بجائے ذوق پر رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طریقۂ تطبیق میں اور کچھ فروعات میں نزاع باقی رہ گئی۔ حضورؐ کے اصولِ استنباط اگر معلوم ہو جائیں تو کتاب و سنت کی تطبیق کا طریقہ واضح ہو جائے گا۔

خامساً، فرعیات کے استنباط کی ضرورت پہلے کی نسبت اب کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ علماء نے اس سلسلہ میں کافی کوششیں کیں۔ پھر متاخرین نے استنباط کے اصول بھی وضع کیے اور احکام کے استخراج کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ اس میں ان کے درمیان اختلاف ہوا جس کا واقع ہونا لازمی تھا۔ ان شاء اللہ یہ اختلاف بموجب

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا۔ (نساء ۳۱) (اگر تم ان کبائر سے بچو گے جن سے تمہیں روکا جاتا ہے تو ہم تمہارے قصور معاف کریں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے)، بخشا جائے گا۔

کتاب و سنت میں جو شریعت بیان ہوئی ہے اس سے استنباطِ مسائل کرنا عین خدا و رسول کی اطاعت ہے۔ اس میں جو اختلاف واقع ہوا اس کے سوا چارہ نہ تھا البتہ اس کے ختم کرنے کی امکانی کوششوں پر ہمارے لیے کوئی پابندی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کا حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

(نساء-۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی، رسول کی اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑنے لگو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ تمہارے لیے بہتر اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے۔

پس ہم جب بھی کسی نزاع میں پڑیں تو ہمارے اوپر واجب ہے کہ اپنے اختلاف کو خدا اور رسول کی طرف لوٹا دیں تاآنکہ نزاع رفع ہو جائے۔

سادساً، اختلاف خواہ اپنی ذات کی حد تک بہت معمولی اور ضرر سے خالی ہو، بسا اوقات بہت بڑے ضرر کا موجب بن جاتا اور خیر و برکت کے دروازے مسدود کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے اختلاف سے بچنے کا حکم دیا اور اس کی شناعت کو قرآن و حدیث میں اتنی وضاحت سے بیان کیا کہ آدمی اسے سب سے بڑا گناہ سمجھنے لگتا ہے۔ جب معاملہ یہ ہو تو ضروری ہے کہ علم کے روشن چہرے پر سے اختلاف کے داغ دور کر دیے جائیں۔

احکامِ رسول کی قسمیں:

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ اطمینان ہمیں کیسے ہوگا کہ حضورؐ کا فلاں حکم واقعی قرآن ہی سے مستنبط ہے۔ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کے بارے میں صرف سمع و طاعت کی تلقین کی گئی ہے، خواہ آپ کا وہ حکم کتاب اللہ میں آئے یا نہ آئے۔ اوپر ہم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قرآن سے مستنبط ہوتا ہے۔ اب ہم اس دعویٰ کی وضاحت کریں گے:

قرآن کی نسبت کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام تین واقعی اور دو فرضی قسموں پر مشتمل ہیں۔ ان قسموں کی تفصیل یہ ہے:

پہلی قسم، وہ احکام جن کے بارے میں حضورؐ نے صراحت فرمائی کہ وہ کتاب اللہ سے مستنبط ہیں حالانکہ ظاہر کتاب کی نص میں وہ حکم موجود نہیں۔ گویا وہ حکم مستنبط ٹھہرے اور حضورؐ کے فرضِ تبیین کے مطابق ہیں۔ ان احکام میں اصل و فرع پر غور کریں گے ان کے استنباط کا پہلو معلوم کرنا دشوار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم، وہ احکام جن کے متعلق حضورؐ نے خود کوئی صراحت نہیں فرمائی مگر قرآن سے ان کے استنباط کا پہلو کلام کی دلالتوں کے ایک عارف پر ظاہر ہے۔ پس ایک تو یہ حکم قرآن سے ماخوذ ہونے کی بنا

پر صحت سے قریب تر ہوتا ہے اور خدا نے نص کتاب کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

ہم نے تیری طرف کتاب اتاری قولِ فیصل کے ساتھ تاکہ تو لوگوں کے درمیان خدا کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرے۔

(نساء۔۱۰۵)

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں سے زیادہ کتاب اللہ کو سمجھنے والے تھے۔ آپ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ جس معاملے کے بعض پہلوؤں کا اشارہ کتاب اللہ میں موجود ہو اس کا کتاب کی روشنی کے بغیر فیصلہ کریں۔ تیسرے، عرب قوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کلام کے اشارات وکنایات کو خوب سمجھنے والے تھے اور حضورؐ کو چونکہ نور و ہدایت اور بصیرت خدا کی طرف سے حاصل تھی اس لیے آپ اس معاملہ میں سب سے زیادہ ذکی تھے۔ احکام کی یہی قسم ثانی ہے جس میں بعض وجوہِ استنباط علماء پر مخفی رہ گئے ہیں لیکن غور کر کے آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے ـــــ اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرے۔

پس اگر وجوہِ استنباط ہم پر واضح ہو جائیں گے تو اصول یہ ہوگا کہ ہم کتاب اللہ کو اصل اور سنت کو اس کی فرع قرار دیں گے۔ صحابہ کا اس پر اتفاق تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن پر غور کرتے اور جب اس میں کوئی رہنمائی نہ پاتے تو سنت کی طرف رجوع کرتے ــ اور یہی بات عقلی بھی ہے۔ ان احکام کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے اشارات سے ان کو مستنبط کیا خواہ ان کے وجوہِ استنباط ہم پر مدت ہائے دراز تک مخفی رہیں۔

تیسری قسم، وہ احکام جن کے متعلق قرآن میں کوئی نص وارد نہیں البتہ وہ اس اضافہ کا متحمل ہے۔ ایسے احکام میں ہم سنت کو مستقل اصل قرار دیں گے کیونکہ ہمیں اطاعتِ رسولؐ کا عام حکم دیا گیا ہے اور رسولؐ کا حکم یکساں طور پر پُرازحکمت ہوتا ہے۔ خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور و حکمت کے مطابق ہو جس سے خدا نے آپؐ کا سینہ بھر دیا تھا۔

اب ہم یہ کہیں گے کہ قرآن کی اپنی تعلیم اور اس تجربہ کے مطابق جو ہم نے حاصل کیا، قرآن جس طرح ظاہر میں نور و برہان ہے اسی طرح اپنے باطن میں رُوح و ریحان ہے۔ گویا اس کی حیثیت وہی ہے جو ایک زرخیز باغ کے لیے بارش اور سورج کی ہوتی ہے۔ یہ جس طرح اپنی نصوص اور اشارات سے عقلوں کو رہنمائی دیتا ہے اسی طرح اپنے قطرات سے دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ بارشِ غیب کے آسمان سے ہوتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو قرآن کی جہتِ مکنون کی طرف بھی رہنمائی فرمائی۔ ارشاد ہوا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم کی

مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

روح وحی کی۔ تم نہیں جانتے تھے شریعت کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو جانتے تھے لیکن ہم نے اسے نور بنایا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے ہو۔

(شوریٰ - ۵۲)

اللہ تعالیٰ نے اس روح سے نبی کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کے احکام کی تیسری قسم بھی حقیقت میں قرآن سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس کا طریقہ استنباط چونکہ مکنون ہے اس لیے ہم ان احکام میں سنت کو مستقل بنیاد مانیں گے۔

یہ تین قسمیں حضورؐ کے احکام کی واقعی قسمیں ہوئیں۔

چوتھی قسم، ان احکام پر مبنی ہے جو کتاب اللہ سے زائد ہیں اور کتاب ان کی متحمل نہیں۔

پانچویں قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو قرآن کے مخالف ہیں۔

یہ آخری دونوں قسمیں فرضی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں کیونکہ ان سے قرآن کا جلی یا خفی نسخ لازم آتا ہے۔ علماء کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے وہ انہی احکام میں ہوا ہے لیکن یہ احکام گنے چنے ہیں۔ اگر ان کے بارے میں کتاب وسنت کے درمیان توفیق پیدا کی جائے تو نزاع ختم ہو سکتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کتاب وسنت کے فہم کا ایک لطیف طریقہ سمجھایا اور اپنے بندے پر ان دونوں کے درمیان توفیق پیدا کرنے کا عظیم دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں حضورؐ کا کوئی حکم ایسا نہیں رہا ہے جس میں لوگ نسخ وغیرہ کے قائل ہوئے ہوں اور قرآن کے ساتھ موافقت نہ دکھائی جا سکی ہو۔ اب تاریکی کا وہ پردہ چاک ہو گیا ہے جس کے نیچے لوگ اختلاف کرتے تھے۔ اب کتاب اللہ کا چشمۂ صافی ابلنے لگا ہے اور اس کا پانی سنت کی جدولوں سے ہوتا ہوا نور و حکمت کی مبارک کیاریوں کو سیراب کرتا ہے۔

اب ہم قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ واللہ الہادی الی سبل الصواب۔

قرآن وسنت کے درمیان توفیق کی چند مثالیں

حدیث رویتِ باری تعالیٰ:

وہ حدیث جس میں رویتِ باری تعالیٰ کی خبر دی گئی ہے (یعنی یہ کہ آخرت میں مومنین کو خداوند تعالیٰ

کا دیدار نصیب ہوگا — مترجم) قرآن کی آیت 'کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ' (تطفیف - ۱۵) (ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے)۔ سے مستنبط ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ رب کریم اور مومنین کے مابین کوئی حجاب نہ ہوگا۔

حدیث لا وصیۃ لوارث :

حدیث لا وصیۃ لوارث (وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں ہو سکتی) احکام میراث سے مستنبط ہے۔ وارثوں کے حصے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے 'تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ' (یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں) اس آیت سے احکام میراث میں ہر کمی وبیشی کی نفی ہوتی ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہو سکتی۔ اس کے حق میں جو وصیت ہے وہ خود خدا نے بیان کر دی اور پھر تصریح فرما دی کہ یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص ان سے تجاوز کرے گا اسے عذاب دیا جائے گا۔

مقدارِ وصیت :

حدیث 'لا وصیۃ فی اکثر من ثلث والثلث اکثر' (ایک تہائی سے زیادہ مال میں وصیت نہیں اور ایک تہائی زیادہ سے زیادہ حد ہے) اس تقسیم سے مستنبط ہے جو اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکے کے سلسلہ میں بیان فرمائی ہے۔ اس تقسیم کے تین حصے ہیں، ایک وارثوں کا حصہ، دوسرا قرض کی ادائیگی اور تیسرا وصیت جو مرنے والے نے کی ہو۔ چونکہ وصیت کا ذکر قرآن نے کر دیا لیکن اس کی مقدار قرآن میں منصوص نہیں تھی اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام نہیں قرار دیا بلکہ مال کے ایک تہائی حصے تک اسے محدود کرنے کا حکم دیا تاکہ احکامِ وراثت کے مقصود کا تحفظ ہو جائے۔ آیت میراث، جیسا کہ اس کے سیاق سے ظاہر ہے، دراصل ورثا کے حقوق کے تحفظ ہی کے لیے نازل ہوئی۔

البتہ یہ حدیث وصیت کا عام حکم نہیں دیتی۔ بلکہ اس کا حکم اس خاص شخص کے لیے ہے جس کے قرض کی مقدار کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ لیکن اس حدیث کو عام رکھنے میں ایک مصلحت بھی ہے اور وہ یہ کہ جب وصیت جائز ہے تو وارثوں کے ورثہ پانے میں دو موانع ہیں۔ ایک قرض دوسرا وصیت۔

خندہ پیشانی سے بات کرنا صدقہ ہے :

سورۃ بقرہ کی آیات :

فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	انہیں اس میں سے کچھ دے دلا دو اور ان سے اچھی طرح بات کرو۔

(نساء - ۸)

اور قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى	اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقے سے اچھا ہے جس کے پیچھے ایذا کی بلا لگی ہوئی ہو۔

(بقرہ - ۲۶۳)

سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خندہ پیشانی سے بات کرنا اور کسی کی غلطی سے درگزر کرنا بھی صدقہ کی ایک قسم ہے۔ یہی حقیقت حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے:

الکلمۃ اللینۃ صدقۃ۔	نرم بات کرنا صدقہ ہے۔

ماں کے حقوق :

حدیث میں آیا ہے کہ کسی شخص نے حضورؐ سے سوال کیا کہ وہ کس کے ساتھ احسان کا سلوک کرے۔ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ"۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو آپ نے دوبارہ یہی جواب دیا اور تیسری مرتبہ سوال کرنے پر فرمایا کہ "اپنے باپ کے ساتھ"۔

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر ماں اور باپ دونوں کا درجہ برابر رکھا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم حضورؐ کے اس ارشادات کی طرف بھی اشارات پاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا	اس کی ماں نے اسے تکلیف سے اٹھائے رکھا اور تکلیف ہی سے جنا۔

(احقاف - ۱۵)

یہاں سے گویا ماں کے ساتھ احسان کے وجوب کی دلیل فراہم فرمائی۔ اس موقع پر باپ کا ذکر ہی حذف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک چیز کو ذکر اور دوسری کو نظر انداز کر دینا برابر نہیں ہو سکتا۔

پھر ایک جگہ یوں ارشاد ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	اور اگر وہ دونوں تیرے ساتھ اس بات پر جھگڑا کریں کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جن کا تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ ماننا۔

(لقمان - ۱۳)

یہ معلوم ہے کہ یہ جھگڑا بیشتر باپ کی جانب سے ہوتا ہے۔ جہاں تک احسان کے سلوک کا تعلق ہے

اسے دونوں کے لیے برابر قرار دیتے ہوئے توحید کے معاملہ میں ان کی بات نہ ماننے کی تلقین کی ہے۔

عقل بھی ماں کے ساتھ زیادہ حسنِ سلوک کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اول تو ماں کو بچے سے محبت زیادہ ہوتی ہے، دوسرے اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر ماں کو اپنے بیٹے کی زیادہ حاجت ہوتی ہے۔

نکاح میں پھوپھی و بھتیجی کو جمع کرنے کی ممانعت :

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر کوئی حکم واجب کیا ہے اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے۔ مثال کے طور پر مقتول کے قصاص کے ذیل میں فرمایا :

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ	تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

(البقرہ - ۱۷۹)

حکم قربانی کی روح کی طرف یوں توجہ دلائی :

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ	اللہ کو نہ قربانی کا خون پہنچے گا اور نہ اس کا گوشت بلکہ اسے تمہارا تقویٰ پہنچے گا۔

(حج - ۳۷)

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کا حکم دے کر اس کی حکمت بیان فرمائی :

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهُ بِالْغَيْبِ	یہ اس لیے کہ خدا جانے کہ غیب میں رہ کر کون اس سے ڈرتا ہے۔

(مائدہ - ۹۴)

اس طرح کی آیات بے شمار ہیں۔ شریعت کے ہر حکم کے تحت کوئی حکمت ہے اور وہی حکمت اس حکم کا مقصود ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر یہ واضح فرمایا کہ شرائع ہماری اصلاح کے لیے ہیں۔ آپ نے ہر حکم کی حکمت بتائی اور ہر اس بات کو کھولا جو اگرچہ صراحت کے ساتھ قرآن میں بیان نہیں ہوئی مگر حکم کے عموم یا خصوص کے تحت داخل ہے۔

اس طرح کی ایک مثال وہ حکم ہے جس میں آپ نے بیوی کے ساتھ اس کی پھوپھی اور خالہ کو نکاح میں جمع کرنے سے روکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بہنوں کو جمع کرنے کی ممانعت (جو خود قرآن سے ثابت ہے) حیا اور صلہ رحم پر مبنی ہے اور حیا حرمت کی اصل بنیاد ہے۔ اگر اس بنیاد پر غور کیا جائے تو عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو ایک ساتھ کیسے جمع کیا جاسکتا ہے جبکہ اس صورت میں حیا اور صلہ رحمی کے علاوہ بے ادبی کی ایک مزید

علت بھی لازم آتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وضاحت آیت محرمات کے منشا کے خلاف نہیں ہے۔ اس آیت میں نمایاں ترین محرم رشتوں کو بیان کرکے بعد میں فرمایا :

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ	تم پر حلال کردی گئیں وہ عورتیں جو ان کے علاوہ ہیں۔

(نساء - ۲۴)

اس میں شک نہیں کہ منکوحہ عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ محرمات سے خارج ہیں لیکن روکا جوگیا ہے تو وہ صرف مشہور رشتوں سے لیکن آگے جمع بین الاختین کی ممانعت بطور اصل کے آئی کیونکہ عادتاً یہی واقعہ پیش آسکتا ہے اور نکاح میں عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو جمع کرنا عادت سے بعید ہے لہٰذا اصل حکم بیان کرکے خلافِ عادت واقعہ کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کے لیے چھوڑ دیا گیا جس طرح نماز کی ہیئت اور بے شمار فروعی احکام لسانِ نبوت کے لیے چھوڑ دیے گئے۔

زنا کی سزا :

جن احادیث کا مآخذ قرآن سے معلوم کرنے میں علماء کو اشتباہ ہوا ہے ان میں وہ حدیث بھی ہے جو حدِ زنا کے باب میں وارد ہوئی ہے یعنی

البکر بالبکر مائة جلدة و تغریب عام والثیب بالثیبة مائة جلدة والرجم	اگر زانی غیر شادی شدہ ہوں تو سزا سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے۔ اگر زانی شادی شدہ ہوں تو سزا سو کوڑے اور رجم کی ہے۔

ان کا خیال یہ ہوا کہ حضورؐ کے اس قول سے شادی شدہ زانی کے لیے محض رجم اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے محض سو کوڑے کی سزا کا حکم لازم آتا ہے۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ماعز اسلمی اور غامدیہ عورت کے قضیہ میں رجم کی سزا نے شادی شدہ زانی کے لیے سو کوڑوں اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے ایک سالہ جلاوطنی کا حکم منسوخ کردیا ہے۔ ان کے نزدیک گویا آیت حدِ زنا[1] اپنے ظاہر مفہوم پر باقی نہیں رہی بلکہ سنت سے تبدیل ہوگئی اور پھر سنت بھی ایک ایسے قضیہ سے تبدیل ہوگئی جس کا موقع ٹھیک معلوم نہیں اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اسے اس کے صحیح محل پر محمول کیا جارہا ہے یا نہیں۔

---

[1] اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور-۲) زانی مرد اور عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

جاننا چاہیے کہ سب سے بنیادی چیز قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔ مجرد ظن کی بنا پر ان کے نسخ کا فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔ حضورؐ کے مذکورہ ارشاد میں واضح طور پر آیا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے سزا سو کوڑے اور جلاوطنی کی ہے۔ دوسری روایت میں ثم تغریب عام (یعنی سو کوڑے اور پھر یک سالہ جلاوطنی) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اسی طرح شادی شدہ زانیوں کے لیے الفاظ ثم الرجم (یعنی سو کوڑے پھر رجم) بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں پہلی حد سو کوڑوں ہی کی ہے۔ لیکن اگر مجرم سزا پانے کے بعد پھر اسی گناہ میں مبتلا ہوں تو انھیں سخت سزا دینا اولیٰ ہے۔ کیونکہ اب ان کا گناہ حدود اللہ کے مقابلہ میں جسارت دکھانے کا ہے اور قرآن نے مفسدین فی الارض اور حدود اللہ کے معاملہ میں سرکشی کرنے والوں کے لیے ان کے گناہ کے درجات کے لحاظ سے سزا کے مختلف درجے بیان کیے ہیں مثلاً تقتیل (بری طرح قتل)، سولی، قطع اطراف (یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا) اور جلاوطنی وغیرہ۔ چنانچہ حضورؐ نے ماعز کے قضیہ میں یہ تصریح فرمائی چونکہ وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کی بداخلاقی حد سے بڑھی ہوئی تھی — (ینب کنبیب التیس) اس لیے اس کو جو سزا دی گئی وہ نکال (عبرت کی سزا) ہے۔ یہودی عورت کے قضیہ میں آپ نے رجم کا جو حکم دیا ہے وہ تورات کے حکم کے مطابق تھا اور قرآن میں احکام نازل ہونے سے قبل حضورؐ تورات کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔

فی الجلد یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب جرم ایک سے زیادہ مرتبہ صادر ہوا تو حضورؐ نے شادی شدہ لوگوں کو عبرت کے لیے سخت سزا دی اور غیر شادی شدہ لوگوں کو نسبتاً خفیف سزا دی۔ اسی لیے حدیث میں لفظ ثم (پھر) واقع ہوا ہے۔ بعض حدیثوں میں جو 'واؤ' آئی ہے اس سے بھی 'ثم' ہی کا مفہوم مراد ہے اور عربی میں کبھی کبھی 'واؤ' اس معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

بقیہ : سورۂ آل عمران (۲)

اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان باتوں کے اندر تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ اور میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی تورات کی اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں[۱] اور میں تمہارے پاس تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمہارا بھی رب ہے[۲]۔ تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ ۵۱

[۱] مراد ان چیزوں کو حلال کرنا ہے جو علمائے یہود نے محض اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے حرام کر رکھی تھیں۔

[۲] انجیلوں میں خدا کے لیے 'میرا باپ اور تمہارا باپ' کی جو تعبیر آئی ہے۔ یہ قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے دراصل جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

آدمی کا تعلق

کنبہ، خاندان، معاشرہ اور ریاست سے

علمائے عمرانیات نے انسانی فطرت کا یہ ایک نہایت اہم راز منکشف کیا ہے کہ وہ ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) ہے۔ اس کی مثال انگور کی بیل کی ہے جو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے ایک سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ سہارا اس کو حاصل ہو تب تو وہ پھلتی پھولتی ہے ورنہ سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ انسان بھی، اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق، پروان چڑھنے کے لیے سہارے کا محتاج ہے۔ یہ سہارا اس کو خاندان اور معاشرے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو جائے تب تو اس کی تمام مخفی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اگر کسی سبب سے یہ حاصل نہ ہو سکیں تو یہ سب دب کر ختم ہو جاتی ہیں۔

یہ تمثیل میرے نزدیک بالکل صحیح ہے۔ بس اتنا فرق دونوں میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انگور کی بیل کو جو سہارا مطلوب ہے وہ اس کو چمن کا مالی مہیا کرتا ہے اور انسان کو جو سہارا مطلوب ہے وہ ابتدائے خلقت ہی سے خود اسی کے اندر مضمر ہے۔ وہ جب دنیا میں آیا ہے تو یکہ و تنہا نہیں آیا ہے، بلکہ اپنا سارا باغ و چمن اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اس نے اس زمین پر جہاں بھی ڈیرا ڈالا تھوڑی ہی مدت میں اپنی بزم اس طرح آراستہ کر لی کہ اس کی ذہنی اور مادی صلاحیتوں کو اپنا عمل کرنے کے لیے جن محرکات اور سہاروں کی ضرورت تھی وہ سب اس کو حاصل ہو گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے انسان —— حضرت آدمؑ —— جب اس دنیا میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنہا نہیں بھیجا، بلکہ ان کی رفاقت کے لیے انھی کی جنس سے ان کا جوڑا پیدا کیا۔ اس جوڑے سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا ہوئیں۔ پھر انھوں نے بتدریج خاندانوں اور قبیلوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ان کی باہمی پیوستگی سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جس کے اندر انسان کے

اجتماعی اور سیاسی شعور کی تربیت کے لیے وہ سب کچھ فراہم ہوگیا جو مطلوب تھا۔ قرآن مجید نے اپنے مختصر اور جامع الفاظ میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ	لے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو
الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ	ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے
وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا	اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا	مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور ڈرو اس اللہ سے
وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي	جس کے واسطے سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے
تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ	ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمہاری
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○	نگرانی کر رہا ہے۔

(النساء — ۴ : ۱)

اس آیت پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اندر ان تمام اساسات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جن پر اس کائنات کے فاطر نے انسانی اجتماعیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کو اجاگر کر دیا جائے اور ان پر زندگی کی تعمیر کی جائے تو خاندان، معاشرہ اور ریاست، ہر چیز کی اٹھان اس نقشہ پر ہوگی جو اس دنیا کے خالق کا بنایا ہوا نقشہ ہے اور جس کو بروئے کار لانے ہی کے لیے اس نے انسان کو اس زمین کی خلافت بخشی ہے۔

یہ بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں :

ایک یہ کہ یہ دنیا کوئی بے راعی کا گلہ نہیں ہے، بلکہ اس کو اس خدا نے وجود بخشا ہے جو سب کا پروردگار ہے اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس میں دھاندلی مچائے اور من مانی کرنے کی جسارت کرے، بلکہ سب کو اس خداوند کی پکڑ سے ڈرتے رہنا چاہیے جو سب کا خالق و مالک ہے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی نفس —— حضرت آدمؑ —— سے وجود بخشا ہے اس وجہ سے نسب کے اعتبار سے سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ عربی اور عجمی، کالے اور گورے، سب برابر ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر ترجیح ہوگی تو اکتسابی صفات کی بنا پر ہوگی۔ اس کے سوا شرف کے دوسرے معیارات سب باطل ہیں۔

تیسرا یہ کہ جس طرح سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اسی طرح سب کی ماں بھی اصلاً ایک ہی —— حضرت حوا —— ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور فوقیت حاصل نہیں ہے ایک ہی ماں باپ سے یہ پورا گھرانا وجود میں آیا ہے۔ حضرت حوا، آیت سے واضح ہے کہ حضرت آدمؑ کی جنس

سے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ عورت مرد کے مقابل میں کوئی حقیر اور فروتر مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ بھی اس شرف میں برابر کی شریک ہے جو انسان کو بحیثیت انسان حاصل ہے۔

چوتھا یہ کہ انسانی معاشرہ میں تعاضد و تناصر کی بنیاد وحدتِ الٰہ، وحدتِ آدم اور اشتراکِ رحم کے عقیدے اور جذبے پر ہے۔ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اس اشتراک کا حق پہچانے اور اس کو ادا کرے اور ساتھ ہی اس امر کا اہتمام رکھے کہ کوئی ایسا نعرہ لوگوں پر غالب نہ ہونے پائے جو اس فطری اشتراک کی بنیا کو منہدم کر دینے والا اور اس کی جگہ کسی جاہلی جذبہ کو ابھارنے والا ہو۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز ابھرتی نظر آئے تو یہ پورے معاشرے کے لیے ایک شدید خطرے کا الارم ہے اور معاشرے کے ہر درد مند کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکنے کے لیے اپنا زور صرف کرے۔ آیت کے آخر میں وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ (اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے) کے الفاظ سے اسی خطرے سے متنبہ کیا ہے۔ اس لیے کہ حقیقت میں یہی ستون ہیں جن پر اسلام نے خاندان، معاشرہ اور ریاست کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جب تک یہ ستون قائم ہیں یہ عمارت قائم رہے گی، جب یہ کمزور ہو جائیں گے۔ عمارت خطرے میں پڑ جائے گی اور جب یہ گر جائیں گے عمارت بھی پیوند زمین ہو جائے گی۔

ان اصولوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آئیے دیکھیے کہ انسان کو اپنے خاندان و کنبہ، اپنی قوم اور معاشرہ اور اپنی ریاست کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہر گام پر کس طرح ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ ذرا غافل ہو جائے تو کس طرح وہ کشتی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس پر وہ اپنے پورے خاندان، بلکہ اپنی پوری قوم سمیت سوار ہوتا ہے۔

آدمی کا تعلق کنبہ اور خاندان کے ساتھ

کنبہ اور خاندان میں آدمی کا سب سے زیادہ قریبی تعلق اوپر کی جانب اپنے ماں باپ اور نیچے کی جانب اپنے بیوی بچوں سے ہوتا ہے اس وجہ سے سب سے پہلے انہی کے اندر دیکھنا چاہیے کہ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے یا کیا ہونی چاہیے۔ اس کی روشنی میں دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ سب سے پہلے ماں باپ کے ساتھ اس کے تعلق کو سمجھیے۔

ماں باپ کے ساتھ آدمی کا تعلق :

آدمی کو پیدا تو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کا ذریعہ اس کے ماں باپ کو بنایا ہے۔ وہی اس کی زندگی کے ابتدائی دور میں جب اس کی حیثیت ایک مضغۂ گوشت سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کی غور و پرداخت، رضاعت و پرورش اور دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ اس خدمت کو، کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر، ایسے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی ذات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گویا انسان کی زندگی کا سارا لطف و عیش اس ننھے سے وجود کی خدمت کے اندر سمٹ آیا ہے جو ان کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان کی اس خدمت و قربانی کا کم سے کم صلہ ان کی اولاد کی طرف سے، جب کہ وہ جوانی کو پہنچے اور وہ پیری اور ناتوانی کے دور میں داخل ہو رہے ہوں، یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی نگاہوں میں جو درجہ ان کا ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا بھی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا درجہ سب سے بلند و بالا ہونا تو ایک امر بدیہی ہے اس لیے کہ حقیقی خالق، پروردگار اور محسن وہی ہے۔ دوسروں کی حیثیت، خواہ ان کے ذریعہ سے کتنا ہی بڑا احسان ظہور میں آیا ہو، وسائل و ذرائع کی ہے اور یہ وسائل و ذرائع جس کو بھی حاصل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عقل و فطرت کی رو سے سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہوا، دوسروں کا حق بہرحال اس کے حق کے تحت ہی ہوگا۔

قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے :

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۚ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا

(لقمٰن - ۳۱ : ۱۴ - ۱۵)

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکرگزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔

ان آیات میں پہلی چیز جو والدین کے عظیم مرتبہ کی شہادت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکرگزاری کے حق کو اپنی شکرگزاری کے ہم پلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے جس سے وہ بات صاف طور

پر نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ آدمی پر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین ہی کا ہے، اور کسی کا بھی نہیں۔ آیت کے فحویٰ سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور اس کے پروان چڑھانے میں جو حصہ والدین کا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی دوسرے کا ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اگرچہ اولاد کی شکرگزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں ہیں، لیکن ماں کا حق اولاد کے اوپر باپ کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات یوں واضح ہوئی کہ اگرچہ شکرگزاری کے حق دار کی حیثیت سے ماں اور باپ، دونوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن تین نمایاں خدمات ——— حمل اٹھائے پھرنے کی سختیاں جھیلنا، وضع کے وقت جان کی بازی کھیلنا اور پھر پورے دو سال تک اپنے خون کو دودھ بنا کر رضاعت کی خدمت انجام دینا ——— صرف ماں ہی کی بیان ہوئی ہیں؛ باپ کی کسی خدمت کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ خدمت اور شکرگزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں ہی ہیں، لیکن ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین گنا ہے۔ آیت سے یہ بات اشارۃً نکلتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشارہ کو ایک شخص کے سوال کے جواب میں واضح فرما دیا۔ سائل نے سوال کیا کہ میرے حسنِ خدمت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں! یہی سوال اس نے دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ دہرایا تو ہر بار آپ نے یہی جواب دیا۔ پھر جب اس نے چوتھی مرتبہ دہرایا تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ تمہارا باپ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب اس آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو :

عن ابی هريرة : قال : جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال : من احق الناس بحسن صحابتي ؟ قال: امك . قال : ثم من ؟ قال: ثم امك . قال : ثم من ؟ قال : ثم امك . قال : ثم من ؟ قال : ثم ابوك[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ میرے حسنِ خدمت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ۔

1 صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب ۱

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اولاد پر ماں باپ کے حقوق کسی دنیوی اختلاف تو درکنار ایمان اور عقیدہ کے اختلاف کی صورت میں بھی باقی رہیں گے۔ ان کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے ایمان اور اس کے دین سے روکنے کے لیے زور لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اولاد ان کی اطاعت سے انکار کردے گی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حق ان کے حق سے بڑا ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود، جہاں تک دنیوی زندگی کے حالات و معاملات ہیں ان میں، ان کے احترام، ان کی خدمت اور ان کی محبت و فرماں برداری کی ذمہ داریاں بدستور اولاد پر باقی رہیں گی۔ بیماری میں ان کی عیادت و تیمارداری، ضرورت میں ان کی تا بہ حدِ استطاعت مدد، کسی مصیبت میں ان کی حمایت و مدافعت، کسی بار کے اتارنے میں ان کے ساتھ فراخ دلانہ تعاون، یہاں تک کہ ان کے تند و تلخ رویہ کے باوجود ان کی ہدایت و مغفرت کے لیے دل سوزی کے ساتھ دعا و استغفار سے اولاد کے لیے بے پروا ہونا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپ کے باپ کا رویہ کتنا ظالمانہ اور سنگ دلانہ تھا، لیکن عین اس وقت جب کہ اس نے آپ کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا آپ نے اس سے کہا تو صرف یہ کہا کہ "سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۚ إِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا" (مریم - ۱۹ : ۴۷) (میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا، وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے) اور آپ نے اس کی تمام تعدیوں کے باوجود، اپنے اس وعدے کے مطابق، اس وقت تک برابر اس کے لیے استغفار کا سلسلہ جاری رکھا جب تک اللہ تعالیٰ نے اس سے آپ کو روک نہیں دیا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک خاص حد پر اس استغفار سے روک دیا، لیکن قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے لیے ان کی اس دردمندی کو اس نے پسند فرمایا اور اس کو ان کے 'اوّاہ' اور 'حلیم'، یعنی دردمند اور بردبار ہونے کا نتیجہ قرار دیا اور خاص اہتمام سے اُن کی اِن صفات کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيْمَ لِأَبِيْهِ
إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ
فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ
لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ
إِبْرٰهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝
(التوبة - ۹ : ۱۱۴)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا تو اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلانِ برأت کر دیا۔ بے شک ابراہیم بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اپنے والدین کی خدمت کا موقع نہیں ملا، لیکن رضاعی ماں، حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آپ کا جو سلوک رہا وہ شاہد ہے کہ جب، رضاعی ماں کے لیے آپ کے جذبات یہ تھے تو حقیقی ماں کے لیے کیا کچھ ہوتے اگر ان کے ظہور میں آنے کی نوبت آتی! روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہؓ جب کبھی دیہات سے مدینہ تشریف لاتیں تو آپ ان کو دیکھ کر فرطِ محبت سے 'میری ماں! میری ماں!' کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر جب وہ رخصت ہونے لگتیں تو آپ ان کو تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ نہایت محبت و اکرام کے ساتھ رخصت فرماتے۔

والدین سے متعلق اولاد کے فرائض:

ان اصولی باتوں کے علاوہ قرآن مجید نے والدین سے متعلق اولاد کے فرائض کی مزید تفصیل بھی بیان کی ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرآئیل میں فرمایا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ
إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ
إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ
أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلٰهُمَا فَلَا
تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ
مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا
كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝
(بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۲۳ - ۲۴)

اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

ان آیات سے بھی پہلی بات تو وہی سامنے آئی جو اوپر گزری کہ آدمی پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے جو یہ ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرے۔

دوسری بات جو سیاق و سباق سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی بندگی کے سوا کسی اور کی بندگی کا روادار ہوتا تو وہ اولاد کو حکم دیتا کہ وہ اپنے والدین کی عبادت کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا۔ لیکن اس نے ان کی عبادت کا حکم نہیں دیا، صرف ان کے ساتھ اچھا

سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ تو جب وہ عبادت میں حصہ دار نہ بن سکے جن کو اللہ نے اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

تیسری یہ کہ والدین کے معاملہ میں اولاد کے لیے امتحان کا اصل مرحلہ اس وقت آتا ہے جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ حق دار تو ہوتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں محتاج نہیں ہوتے، لیکن بڑھاپے میں وہ محتاج ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اسی طرح محتاج ہوں جس طرح اولاد اپنی شیرخوارگی اور طفولیت کے دور میں محتاج رہی ہے۔ اس وجہ سے اُس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی اس شفقت و رحمت کو یاد کرکے جو انھوں نے اس کے بچپن میں اس پر کی ہے ان کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کرکے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔ پس مبارک ہے وہ فرزند جس نے یہ حق پہچانا اس لیے کہ اس نے جنت حاصل کرنے کی وہ راہ پالی جس سے زیادہ آسان راہ جنت حاصل کرنے کی اور کوئی نہیں ہے۔ انسانی فطرت میں شفقت اور رحمت کا جو جذبہ قدرت نے اولاد کے لیے والدین کے اندر رکھا ہے وہی جذبۂ رحمت و قربانی اولاد کے اندر والدین کے لیے رکھا ہے بشرطیکہ اولاد ان کے حق کو یاد رکھے۔ اگر کسی کے اندر یہ جذبہ مردہ ہوگیا ہے تو اس اعتبار سے وہ بدقسمت ترین انسان ہے کہ جنت حاصل کرنے کا وہ موقع اس نے کھو دیا جس سے زیادہ آسان موقع اس کو دوسرا ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ یہی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں بیان ہوئی ہے:

عن ابی هریرة، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: رَغِمَ انفه، ثم رغم انفه، ثم رغم انفه. قیل: من؟ یارسول الله! قال: من ادرك والدیه عند الکبر احدهما او کلیهما، ثم لم یدخل الجنة۔[1]	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہوئی! خاک آلود ہوئی!! خاک آلود ہوئی!!! سوال کیا گیا کہ کس کی؟ یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: اس کی جس نے اپنے ماں باپ کو، ان میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو ان کے بڑھاپے میں پایا، لیکن جنت حاصل نہ کرسکا۔

چوتھی نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی اگر عمر کی اس حد کو پہنچ جائیں جو ارذلِ عمر کہلاتی ہے، جس میں آدمی سمع و بصر اور ہاتھ پاؤں سے قاصر اور جملہ ضروریات میں

1 صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب ۳

دوسروں کا محتاج، بلکہ ان پر بوجھ بن کر رہ جاتا ہے تو گویہ امتحان اولاد کے لیے ایک بڑا ہی صبر آزما امتحان ہے، لیکن اس کی وفاداری اور سعادت مندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے دل کے اندر نہ ان سے بیزاری پیدا ہونے دے اور نہ تنگ آکر کوئی کلمہ زبان سے ایسا نکال بیٹھے جو ان کی دل شکنی یا توہین کا باعث ہو۔ بلکہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہی بات زبان پر لائے جو ایک بوڑھے ماں باپ کے لیے ایک شریف بیٹے کے شایانِ شان ہے۔ 'اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا' (بنی اسرآءیل - ۱۷: ۲۳) (اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو) کے ٹکڑے میں اسی امتحان سے آگاہ فرمایا ہے۔ لفظ 'اُف' عربی میں کسی چیز سے دل کی شدید بیزاری کی تعبیر ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: 'اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' (الانبیآء - ۲۱: ۶۷) (تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو)۔ اس کے بعد لفظ 'نہر' جو جھڑکنے کے معنی میں آتا ہے اسی قلبی بیزاری کا گویا اظہار ہے۔ جب آدمی کے دل میں بیزاری پیدا ہو جائے تو لازماً لب و لہجہ میں خشونت اور کرختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ پھر جب یہ برق خرمنِ امید کو جلا کر رکھ دے گی اور دوسری طرف اولاد کے سارے کیے کرائے کو بھی خاک میں ملا دے گی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو چیز اس کے لیے جنت کی ضامن بن سکتی تھی وہ اس کے لیے ابدی نامرادی اور تباہی کا سبب بن جائے گی۔

یہ نفسیاتی حقیقت ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ اولاد بچپن میں خواہ کتنی ہی شدید بیماری میں مبتلا ہو اور اس کے سبب سے ماں باپ کتنے ہی دکھ میں مبتلا ہوں، لیکن وہ انتہائی ناداری اور افلاس کے باوجود اولاد کو کبھی بار محسوس کرکے پھینکنے کے خواہاں نہیں ہوتے، بلکہ اس کی صحت کی آرزو میں آخری لمحہ تک سینہ سے چمٹائے در در لیے پھرتے ہیں کہ شاید کسی ڈاکٹر یا حکیم کی نظرِ کرم ہو جائے اور اگر ڈاکٹروں اور حکیموں تک نہیں پہنچ پاتے تو سیانوں اور جھاڑ پھونک والوں ہی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ شاید انھی کی توجہ سے ان کا بجھتا چراغ روشن ہو جائے۔ اس جد و جہد میں وہ اپنے رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ دوسرے خواہ کتنے ہی مایوس ہو جائیں، لیکن وہ مایوس ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا یہ جذبۂ رحمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اس کو بھلا کر کوئی شریف ابنِ شریف چین کی نیند سو سکے۔ بلکہ وہ ان کے بڑھاپے میں، اپنی نمازوں میں، ان کے لیے برابر یہ دعا بھی کرے گا کہ 'رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا' (بنی اسرآءیل - ۱۷: ۲۳) (اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا اور ساتھ

ہی ان کے ایک ایک سانس کو اپنے لیے دولتِ گراں مایہ سمجھے گا کہ ان کی خدمت کی ہر سعادت اس کے لیے جنت کی بشارت اور خوشنودیِ رب کی ضمانت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

رِضَی الرب فی رِضَی الوالد وسَخَطُ الرب فی سخط الوالد[1]

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔

پانچویں حقیقت جو آیت کے آخری الفاظ: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا (بنی اسرآئیل ۱۷: ۲۳) (اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا) سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت و اطاعت صرف رحمت کے جذبہ اور ان کی اس بے پایاں شفقت کے صلہ کی حیثیت سے ہونی چاہیے جو انہوں نے اولاد پر اس کے بچپن میں کی ہے۔ اس میں کسی ریا کی خواہش یا لوگوں کی ملامت کے اندیشہ یا ان کے اموال و جائداد کی طمع کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ جس طرح ریا کی عبادت اور غیر مخلصانہ اطاعت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اسی طرح یہ خود غرضانہ خدمتِ والدین بھی اس کے ہاں کسی صلہ کی حق دار نہیں ٹھہرے گی۔ اگرچہ یہ حقیقت کسی ایسے شخص کو سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آسکتی جس کو دین کی باتیں سمجھنے کا کچھ ذوق ہو، لیکن کسی کو اس میں کچھ تردد ہو تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ والدین کی صحیح خدمت کی راہ میں ایسا مرحلہ بھی پیش آنے کا امکان ہے جس میں اس شخص کے سوا کوئی دوسرا اس امتحان میں پورا اتر ہی نہیں سکتا جو اس محرک کے سوا جو اوپر مذکور ہوا کسی اور محرک کے تحت اس فرض کو انجام دینے کا ارادہ کرے گا۔ صرف ایک ہی چیز اس کو سخت سے سخت امتحان میں بھی پا برجا رکھ سکتی ہے کہ وہ یاد رکھے کہ اس کے ماں باپ کسی سخت سے سخت امتحان میں بھی اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگنے والے نہیں بن سکتے تھے درآنحالیکہ ان کو مجھ سے اس وقت کسی منفعت کی امید نہیں ہو سکتی تھی تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ میں ان کی خدمت سے گھبرا کر انہیں چھوڑ بیٹھوں جب کہ میں ان سے کم یا زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی توقع بھی رکھتا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ماں باپ کی خدمت ایک عظیم عبادت بھی ہے۔ اس امر کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے:

---

[1] سنن الترمذی: کتاب البر والصلة، باب ۳

عن عبد الله بن عمرو، قال: جاء رجل الی النبی صلی الله علیه وسلم لیستأذنه فی الجهاد فقال: احیّ والداك؟ قال: نعم. قال: ففیهما فجاهد[1]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں حصہ لینے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اس سے سوال کیا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: تم ان کی خدمت کرو، تمہارے لیے یہی جہاد ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ:

اقبل رجل الی نبی الله صلی الله علیه وسلم فقال: ابایعك علی الهجرة والجهاد، ابتغی الاجر من الله. قال: فهل من والدیك احد حیّ؟ قال: نعم. بل کلاهما. قال: فتبتغی الاجر من الله؟ قال: نعم. قال فارجع الی والدیك فاحسن صحبتهما[2]

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، دونوں ہی۔ آپ نے دریافت فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کے اجر کا طالب ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جاؤ اور ان کی خدمت کرو جیسا کہ خدمت کا حق ہے۔

اس خدمت کا یہ مزاج بھی مقتضی ہے کہ اس میں اخلاص کی شرط لازم ہو اس لیے کہ اسلام میں کوئی خدمت اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب البر والصلة والآداب، باب ۱

[2] صحیح مسلم: کتاب البر والصلة والآداب، باب ۱

امین احسن اصلاحی

اسلامی معاشرہ کا سب سے بڑا آدمی

یہ بات ہم مسلمانوں میں کچھ متفق علیہ سی چلی آرہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ اور اصلاحی کوششوں سے جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اس کے سب سے بڑے آدمی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوئے۔ ان کی یہ بڑائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم رہی اور آپ کی وفات کے بعد بھی مسلّم رہی۔ اس چیز میں نہ کبھی کسی نے اختلاف کیا اور نہ ہی اس میں کسی اختلاف ہی کی گنجائش تھی۔ لیکن ان کی بڑائی پر پوری امت کے اس اتفاقِ عام کے باوجود شاید بہت تھوڑے ہی لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑے آدمی کیوں قرار پائے اور ان کے وہ کیا اوصاف وفضائل ہیں جن کی وجہ سے تمام مسلمانوں کی نگاہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ان کی طرف اٹھتی رہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انہی کی طرف اٹھیں۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے جو چیزیں بڑائی کا معیار سمجھی جاتی تھیں ان میں سے کسی چیز میں بھی حضرت ابوبکرؓ کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں تھا۔ وہ قریش کے معزز قبیلہ سے ضرور تھے، لیکن جاہلیت میں قریش کی دوسری شاخوں کو جو جلیل القدر عہدے اور مناصب حاصل رہے، اس طرح کے جلیل القدر عہدے حضرت ابوبکرؓ کے قبیلہ تیم کو حاصل نہیں ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک کامیاب تاجر ہونے کی وجہ سے مالی اعتبار سے بالکل مطمئن تھے، لیکن قریش میں —— اور مسلمانوں میں بھی —— ان سے کہیں زیادہ مال دار اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ ان کی قوم کے اندر ان کو اعتماد اور عزت کی جگہ ضرور حاصل تھی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قریش کے نظامِ جاہلی میں عزت وسرفرازی کی جو جگہ دوسروں کو حاصل تھی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا ان کے خاندان اور قبیلہ کو حاصل نہیں تھی۔ خطابت، شاعری، کہانت، اور لیڈرانہ جوڑ توڑ کے بھی وہ مرد میدان نہیں تھے کہ ان چیزوں کے لیے ان کی قوم کے دلوں میں جو احترام تھا اس کے سہارے ہی وہ لوگوں کی نگاہوں میں عزت واحترام حاصل کر سکتے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر

ان کی وہ کیا خدمات اور خوبیاں تھیں جن کے سبب سے تاریخِ انسانی کے سب سے زیادہ پاکیزہ معاشرے نے ان کو اپنا لیڈر بنایا اور اپنے دین اور دنیا کے ہر معاملہ میں ان کی رہنمائی پر پورا پورا بھروسہ کیا؟ اس سوال کا جواب یوں تو ہر مسلمان کے لیے اہمیت رکھتا ہے، لیکن خاص طور پر ان لوگوں کے لیے اس سوال کے جواب کی بڑی ضرورت ہے جو آج مسلمانوں کی قوم کو اسلامی معاشرے کی اصلی خصوصیات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بات کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کہ مسلمان اپنے لیڈروں کی جانچ پرکھ میں انہی معیارات اور کسوٹیوں سے کام لیں جو اسلام نے ان کو دی ہیں۔ اور جن سے کام لینے کا نتیجہ ایک زمانے میں یہ نکل چکا ہے کہ مسلمانوں کو ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے لیڈر نصیب ہوئے ہیں۔

میں آگے کی سطور میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا اور بالاجمال یہ بتاؤں گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ کیا خوبیاں اور کیا خدمات ہیں جن کے سبب سے ایک سچے اسلامی معاشرے میں ان کو قیادت کا اتنا اونچا مقام حاصل ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس کی بلندی سے مرعوب ہو گئے اور نہایت حسرت کے ساتھ یہ فرمایا کہ ”لقد اتعبت الخلفاء بعدك“۔ اگر معیار یہ ہے جو آپ نے اپنی خدمات اور اپنی خوبیوں سے قائم کر دیا ہے تو آپ کے جانشینوں میں سے کون آپ کی ہمسری کی ہمت کرے گا۔

پاکیزگیٔ فطرت:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو حضرت ابوبکرؓ کی سیرت پر غور کرنے والے کے سامنے آتی ہے وہ ان کے قلب کی صفائی اور فطرت کی پاکیزگی ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ اُدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اپنی نبوت کا اظہار کیا اِدھر انہوں نے فوراً بغیر کسی تردد اور بغیر کسی جھجک کے اس کی تصدیق کی۔ وہ قوم کے ایک معزز آدمی تھے، اور ایک معزز آدمی کے لیے جو اپنی قوم کا لیڈر بھی ہو کسی دوسرے کی لیڈری تسلیم کرنے میں بڑی زحمتیں پیش آیا کرتی ہیں، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس طرح کی کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیڈر ہونے کے باوجود لیڈری کے پندار سے ان کا دل بالکل پاک تھا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ ایک نکتہ چیں آدمی تھے۔ ان کی جاہلیت کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی بات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے والے نہ تھے اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یونہی مقلدانہ مان لیا ہو۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی غیر معمولی صفائیٔ قلب اور سلامتیٔ فطرت کے سبب سے ان کا دل پہلے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور ان باتوں کی حقانیت پر گواہ تھا جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اسلام کو بالکل اپنے دل

کی آواز سمجھ کر قبول کیا۔ جس شخص کی جاہلیت کی زندگی کے متعلق ابن الدغنہ کی یہ شہادت ہو کہ "تم اعزہ پروری کرتے ہو، سچ بولتے ہو، حاجت مند کی حاجت برآری کرتے ہو، گردشِ روزگار کے مارے ہوؤں کی مدد کرتے ہو" آخر اس شخص کے دل پر کیا زنگ ہو سکتا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اسلام کو قبول کرنے میں دیر لگاتا۔ اس طرح کے پاکیزہ اور صاف قلوب کے لیے پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ معجزہ ہوتا ہے اور وہ حق کو سنتے ہی اس کو قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اس خصوصیت کی ان الفاظ میں شہادت دی: "میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی اس کو اس میں کچھ نہ کچھ جھجک اور فکر و تردد کی حالت ضرور پیش آئی۔ بجز ابوبکر بن ابی قحافہ کے — میں نے ان کے سامنے جس وقت اس بات کا ذکر کیا تو نہ اس کے قبول کرنے میں ان کو کوئی رکاوٹ پیش آئی اور نہ وہ اس معاملہ میں ذرا متردد ہوئے۔"

صالحین پر اثر:

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی اس پاکیزگیٔ فطرت کی وجہ سے بہت سے پاکیزہ فطرت اور صالح لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا، جو ان کی طبیعت کی خوبیوں کی وجہ سے ان کے گرویدہ تھے اور زندگی کے معاملات میں ان کے فیصلوں پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کر لیا تو اپنے ایسے صائب الرائے ساتھی اور رہنما کے فیصلے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس گروہ کے اندر عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاصؓ اور ابوعبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہم) جیسے بڑے بڑے لوگ تھے، جن کے ہاتھوں اسلام کی بڑی خدمتیں انجام پائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسلام نے ان سب لوگوں کے لیے اسلام کا راستہ کھول دیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کا اسلام لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک ایک شخص اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے لحاظ سے، اسلام کی دولت تھا۔ اور اس شخص کی عظمت اور بڑائی میں کبھی شک نہیں کیا جا سکتا جو اس قسم کے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کا سبب تھا۔

اخلاقی جرأت:

اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور دینِ حق کا بول بالا کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اخلاقی جرأت بھی ایک بے مثال چیز ہے۔ یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی قوم کے ایک معزز لیڈر بھی تھے اور ایک کامیاب تاجر بھی۔ ایک لیڈر کے لیے اول تو یہی مشکل ہے کہ وہ کسی دوسرے لیڈر کی لیڈری تسلیم کر کے اپنی لیڈری خطرے

میں ڈالے۔ ثانیاً اگر وہ ایک کامیاب تاجر بھی ہو تب تو اس کے لیے تقریباً یہ محال ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جو ان تمام حلقوں میں اس کو مطعون بنا دے جن سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو۔ کوئی عام تاجر تو کبھی اس طرح کی جرأت کر نہیں سکتا۔ اور اگر کوئی تاجر اپنے اخلاقی اوصاف میں عام سطح سے بہت زیادہ بلند ہوگا تو اس سے بھی زیادہ سے زیادہ جس اخلاقی جرأت کی توقع کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ اگر وہ کسی تحریک کو حق سمجھتا ہے تو اس کو دل سے قبول کر لے اور خاموشی کے ساتھ جس حد تک اس کے امکان میں ہو اس کی مالی مدد کرتا رہے۔ رہی یہ بات کہ وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا سارا زر و دافر اور اپنی ساری تجارت قربان کر دے تو یہ ایک بہت بڑا مرتبہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی جیسے شخص کو حاصل ہو سکتا تھا اور کمال درجہ پر یہ مرتبہ انہی کو حاصل ہوا۔ ان کے بعد جن بلند ہمت لوگوں کو بھی اس راہ میں کوئی قدم بڑھانے کی توفیق حاصل ہوئی ہے صدیقِ اکبرؓ کے عملی نمونہ ہی نے درحقیقت ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

مظلوموں کی حمایت کے لیے انفاق:

اسلام کے ابتدائی دور کی صبر آزما آزمائشوں میں راہِ حق کے مظلوموں کو دعوتِ حق کے دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مال نے جو کام کیا ہے اس کی مثال بھی مشکل سے مل سکے گی۔ بلالؓ اور ابن فہیرہؓ جیسے لوگ جو غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قسم کی حمایت سے محروم ہونے کی وجہ سے اسلام لانے کے جرم میں اپنے آقاؤں کے ہاتھوں نہایت درد انگیز مظالم کے شکار ہو رہے تھے، صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان مظلوموں کو ان کے ظالم آقاؤں کے پنجے سے بھاری بھاری قیمتوں، بلکہ منہ مانگے داموں، پر خرید کر آزاد کیا اور اس کام میں جس فیاضی کے ساتھ انہوں نے اپنی دولت خرچ کی اس کا اندازہ صرف ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام لائے ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد موجود تھے، لیکن دس سال کے بعد جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کی ہے تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار درہم بچ رہے تھے۔ درآنحالیکہ اس دوران میں ان کا تجارتی کاروبار جاری رہا اور وہ اس کاروبار سے برابر نفع بھی اٹھاتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثاریاں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور سے لے کر مصائب اور شدائد کے اخیر دور

غرض جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثاریاں کی ہیں اس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے۔ جب کبھی قریش آپؐ کی ایذادہی کے درپے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی جان اور اپنی عزت، دونوں چیزیں خطرے میں ڈال کر آپؐ کی حمایت کی اور آنے والے خطرے کا خود آگے بڑھ کر مقابلہ کیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہیں۔ ایک روز قریش کے بڑے بڑے لیڈر حجر میں جمع ہوئے کہ اسلامی دعوت کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی لیڈری کو جو خطرہ درپیش آگیا ہے اس کے مقابلہ کی کچھ تدبیریں سوچیں۔ اس اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُدھر آنکلے۔ یہ لوگ غصہ میں بھرے بیٹھے تھے۔ آپؐ کے اوپر پل پڑے اور کہنے لگے کہ تم ہی ہو جو ہمارے دین اور ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں، میں ہی ہوں"۔ اتنے میں ایک شخص نے جھپٹ کر آپؐ کی چادر پکڑلی۔ اور آپؐ سے دست و گریبان ہونا چاہا کہ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ آگئے۔ انہوں نے فوراً تاڑلیا کہ ان لوگوں کی نیت بد ہے۔ چنانچہ انہوں نے سارا خطرہ اپنے سر پر لے لیا اور آگے بڑھ کر روتے ہوئے یہ فرمایا: "کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ صرف اللہ ہی کو اپنا رب کہتا ہے؟"

ہجرت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رفاقت کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو منتخب فرمایا اور باوجودیکہ وہ اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر جان کی بازی ہے اور یہ سفر جس قدر آپؐ کے لیے خطرناک ہوگا اسی طرح اس شخص کے لیے بھی خطرناک ہوگا جو اس سفر میں آپؐ کا ساتھ دینے کی جرأت کرے گا۔ لیکن اس خطرہ سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے نہ صرف آپؐ کی رفاقت قبول فرمائی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انتخاب کو سب سے بڑا شرف سمجھا اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہوئے کہ اس نے اپنے نبی پر جان نثار کرنے کا ان کو ایک موقع عنایت فرمایا۔

اپنی اس جاں نثاری کا ایک بہترین ثبوت انہوں نے اس وقت دیا جب غارِ ثور میں پناہ لینے کا موقع آیا ہے۔ وہ غار کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داخل ہونے سے پہلے داخل ہوئے تاکہ اس کے اندر اگر کوئی درندہ یا موذی جانور ہو تو اس کی آفت سے وہ خود دوچار ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گزند سے محفوظ رہیں۔

نرمی اور سختی کا بہترین امتزاج:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خصوصیات میں سے ایک بڑی نمایاں خصوصیت ان کے مزاج کے اندر نرمی اور سختی کا حیرت انگیز امتزاج ہے۔ اس اعتبار سے وہ مزاجِ نبوت سے قریب ترین انسان تھے جو

موقعہ سختی کے ہوتے تھے ان موقعوں پر وہ اتنے سخت ہوجاتے تھے جتنا اس موقع کا تقاضا ہوتا تھا اور جہاں نرمی کا موقع ہوتا تھا وہاں وہ کبھی غصہ یا بے جا حمیّت سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک یہودی فخاص نامی نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو حضرت ابوبکرؓ کو طیش آگیا اور اس کو تھپڑ کھینچ مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تمہارا سر قلم کردیتا۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے نمائندے نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا طعنہ دیا کہ کسی بڑے خطرے کا موقع پیش آئے گا تو آپ کے ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑدیں گے تو اس کے اس طعنہ کو سن کر حضرت ابوبکرؓ کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے ایسے سخت الفاظ میں اس کو جواب دیا کہ ان کے جیسے حلیم الطبع آدمی کی زبان سے وہ جواب حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، لیکن غیرتِ حق نے ان کی زبان سے وہ الفاظ نکلوادیے اور مخاطب چونکہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت ابوبکرؓ کے زیرِ احسان رہ چکا تھا اس وجہ سے وہ بات کو پی گیا۔

دوسری طرف بدر کے معرکے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جب فتح عطا فرمائی اور کفار کے بہت سے سردار گرفتار ہوکر آگئے تو باوجودیکہ ان لوگوں نے مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو نہایت مظلومیت کی حالت میں ان کے گھروں سے نکالا تھا، جن میں خود حضرت ابوبکرؓ بھی شامل تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ ان قابو میں آئے ہوئے دشمنوں سے انتقام لینے کے بجائے ان کے لیے سراپا رحم و شفقت بن گئے اور ان کے قتل کا مشورہ دینے کی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت پُرزور سفارش ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی فرمائی کہ ممکن ہے یہ لوگ اس احسان سے متاثر ہوکر اسلام لائیں اور خدا کی رضا حاصل کریں۔

دوررسی:

حدیبیہ کی صلح اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ یہ صلح جن حالات میں اور جن شرائط کے ساتھ ہوئی تھی وہ حالات اور شرائط اوّل اوّل مسلمانوں کے لیے نہایت مایوس کن اور دل شکن تھے، لیکن اس صلح سے آخرکار جو نتائج نکلے وہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے نہ صرف حوصلہ افزا ثابت ہوئے، بلکہ وہ فی الواقعہ ایک 'فتح مبین' کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس صلح میں حضرت ابوبکرؓ نے جو پارٹ ادا کیا وہ ان کے تدبّر، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کی ایک نہایت ناقابلِ انکار دلیل ہے۔ یہ صلح جن شرائط پر طے پائی ان کو قبول کرنے کے لیے صحابہؓ میں سے ایک شخص بھی تیار نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ان شرائط کے اس قدر سخت مخالف تھے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُو در رُو اس کی مخالفت میں نہایت تیز لب و لہجہ میں گفتگو کی ـــ

جس کا ان کو زندگی بھر پچھتاوا رہا ـــــــ صرف اکیلے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو اس معاملے میں برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس صلح نامہ کی تائید فرمائی اور اپنے زور و اثر سے کام لے کر مسلمانوں کو اس پر راضی اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عمرؓ کا غصہ بھی انہی کی کوششوں سے فرو ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو معاہدہ ظاہر میں مسلمانوں کے مصالح کے اس قدر خلاف تھا کہ مسلمانوں کی پوری جماعت میں سے ایک شخص بھی اس پر مطمئن نہ ہو سکا اس کی مخفی مصلحتوں کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے ظاہر ہونے سے کئی سال پہلے کس طرح دیکھ لیا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان مصلحتوں کو وحی اور الہام کی روشنی میں دیکھ لیا ہوگا، لیکن ابوبکر صدیقؓ نے کس روشنی سے دیکھا؟ اگر یہ نبی پر ایمان کی روشنی تھی تو بلاشبہ یہ ایمان کا ایسا بلند درجہ ہے جو صدیقِ اکبرؓ کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور اگر انہوں نے اس معاہدے کے مضمرات اور مخفی مصلحتوں کو محض اپنی سیاسی بصیرت اور اپنے تدبر کی روشنی میں پڑھ لیا تھا تو اس سیاسی بصیرت اور اس دور رسی کی مثال بھی سیاست اور تدبر کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

اللہ، رسولؐ اور مسلمانوں کی نظر میں یکساں محبوبیت:

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مخلصانہ دینی خدمات کے ذریعے سے اللہ، اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی نظر میں یکساں محبوبیت کا وہ بلند درجہ حاصل کر لیا تھا جو صرف انہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس محبوبیت کی ایک سے زیادہ شہادتیں ہماری اسلامی تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں اپنی جگہ پر نماز پڑھانے کی خدمت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سپرد فرمائی اور اس کے خلاف آپ کو جو مشورے دیے گئے آپ نے نہایت شدت کے ساتھ وہ مشورے رد فرما دیے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نماز پڑھانی شروع کر دی تو ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے نماز پڑھانے کے لیے درخواست کی اور وہ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ حضرت عمرؓ بلند آواز آدمی تھے جب انہوں نے تکبیر کہی تو ان کی تکبیر کی آواز حضرت عائشہؓ کے کمرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں پڑی۔ آپ نے ان کی آواز سن کر فرمایا: "ابوبکر کہاں ہیں؟ اس چیز کو نہ تو اللہ پسند کرے گا اور نہ مسلمان"۔

اللہ اور مسلمانوں کی نظر میں محبوبیت کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں محبوبیت اور اعتماد کی جو جگہ حاصل تھی اس کی شہادت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی ہے: "تمام صحابہ میں کوئی نہیں ہے جس کے ان سے زیادہ احسان ہوں۔ اگر میں انسانوں میں کسی کو دوست

بنانا پسند کرتا تو ابوبکرؓ کو اپنا دوست بناتا۔ البتہ ہمارے درمیان رفاقت، اخوت اور ایمان کا رشتہ ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس ہم کو جمع کر لے"۔

ضبط و تمکین:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں سب سے زیادہ آزمائش کا موقع وہ آیا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی اگر سوء ادب نہ ہو تو اس کو عشق کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس عشق کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر جس صبر و ضبط کا ثبوت انہوں نے دیا اس صبر و ضبط کا ثبوت کوئی اور نہ دے سکا۔ بلکہ یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہوش گوش نے مسلمانوں کو سنبھالا نہ ہوتا تو تمام امت ایک نہایت خوفناک فتنہ میں مبتلا ہو جاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر اکثر مسلمانوں کے اوسان قائم نہ رہے۔ حضرت عمرؓ جیسے دل و دماغ کے آدمی کا یہ حال ہوا کہ مسجد نبوی میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے یہ تقریر کرنی شروع کر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات نہیں پائی ہے، بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ چالیس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے اور پھر لوٹ آئے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے ہیں اور کچھ مدت کے بعد لوٹ آئیں گے اور اگر کوئی شخص اس بات پر اصرار کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے تو اس کو قتل کی دھمکی دیتے اور کہتے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لائیں گے تو اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دیں گے۔

جس حادثہ نے حضرت عمرؓ جیسے شخص کے دماغی توازن کو اس درجہ درہم برہم کر دیا ہو اس کا اثر دوسروں پر کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے اور اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس خبر کا کیا اثر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دل پر ہوا ہوگا۔ جن کا حال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی معمولی سی تکلیف کے تصور سے بھی بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن آیئے اور دیکھیے کہ اس سب سے بڑے حادثے کا وہ کس صبر جمیل سے مقابلہ کرتے ہیں اور کس طرح قرآن کی روشنی کے ذریعے مسلمانوں کو ایک بڑی تاریکی میں گھر جانے سے بچا لیتے ہیں۔ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی حضرت ابوبکرؓ مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ مدینے سے کچھ فاصلے پر سنح میں تھے۔ حادثہ کی اطلاع پا کر شہر میں آئے تو لوگوں کو سراسیمہ اور حضرت عمرؓ کو مسجد میں تقریر کرتے ہوئے پایا۔ لیکن وہ بغیر ذرا بھی رکے ہوئے سیدھے حضرت عائشہؓ کے مکان میں داخل ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی اور بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: "کتنے پاکیزہ

تھے زندگی میں اور کتنے پاکیزہ ہیں مرنے کے بعد"۔ اس کے بعد لوگوں کے پاس گئے اور فرمایا:

"اے لوگو! جو لوگ محمدؐ کی پرستش کر رہے تھے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مر گئے اور جو لوگ اللہ کی پرستش کر رہے تھے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا" اس کے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

محمدؐ تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکرگزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔

(آل عمران - ۳ : ۱۴۴)

حضرت عمرؓ نے یہ آیت سنی تو ان کو یقین آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع انتقال فرما چکے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہوئے شدتِ غم سے زمین پر گر پڑے۔ اس کے بعد انہوں نے اور دوسرے مسلمانوں نے معاملہ کی اہمیت پر اس کے صحیح پہلو سے غور کرنا شروع کیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو ان کے ذہن ایک بالکل دوسری راہ پر چل پڑے تھے۔ جس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بصیرتِ ایمانی نے اگر ان کو بالکل وقت پر نہ موڑا ہوتا تو نہیں معلوم وہ اس غلط راہ پر کتنی دور تک نکل جاتے۔

سیاست و تدبر:

سیاست و تدبر کے لحاظ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو مقام حاصل تھا اس کے ثبوت کے لیے ان کا صرف ایک کارنامہ کافی ہے جو انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انجام دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پھیلتے ہی ابھی آپ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر اس سوال پر غور کرنا شروع کر دیا کہ آپؐ کے بعد آپؐ کی خلافت کا حق کس کو پہنچتا ہے: انصار کو یا مہاجرین کو۔ خزرج کے لیڈر سعد بن عبادہؓ کی رہنمائی میں انصار کی عام رائے یہ تھی کہ یہ حق انصار کو حاصل ہے نہ کہ مہاجرین کو۔ وہ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے اس قدر سرگرم اور پرجوش تھے کہ ان کے بعض لیڈروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان کے اس حق کو تسلیم نہ کیا گیا تو اس کے لیے تلواریں نیام سے نکلیں گی۔ انصار کے حلقہ میں ہلکی سے ہلکی رائے اس معاملہ میں ان لوگوں کی تھی جو منّا امیر و منکم امیر (خلیفہ انصار و مہاجرین

دونوں میں سے باری باری مقرر ہو) کے فارمولے پر سمجھوتے کے لیے راضی تھے۔

ادھر سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ ہنگامہ گرم تھا اور ادھر مہاجرین کے بڑے بڑے لیڈروں کا یہ حال تھا کہ حضرت عمرؓ، حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے مسئلہ پر غور کر رہے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تجہیز و تکفین کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع اور انصار کے لیڈروں کی تقریروں کی اطلاع دی۔ انہوں نے یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو بلایا۔ پہلے تو انہوں نے اپنی مشغولیت کی بنا پر معذرت کی، لیکن حضرت عمرؓ نے معاملے کی اہمیت سمجھائی تو مجبوراً وہ باہر آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حالات سنتے ہی فوراً محسوس کر لیا کہ اگر جلد سے جلد صورتِ معاملہ پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ امت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔ چنانچہ اسلام اور مسلمانوں کی محبت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے اہم ترین کام کو ملتوی کر کے پہلے مسلمانوں کو ایک ہولناک فتنے سے بچانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ فوراً حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے پہلے ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انصار کے بعض لیڈروں کی زہر آلود تقریروں نے لوگوں کے ذہن بری طرح خراب کر دیے ہیں اور اکثریت کے تیور اچھے نہیں رہے ہیں۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ حالات کو درست کرنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پہلے حضرت عمرؓ نے تقریر کے لیے اٹھنا چاہا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کی طبیعت کی تیزی کا خیال کر کے اس موقع پر ان کا تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خود اٹھ کر ایک تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ایسی فصیح و بلیغ، ایسی مدلل، ایسی منصفانہ اور ایسی حکیمانہ تھی کہ تمام سلیم طبیعتوں کے اندر گھر کر گئی۔ انصار کے بعض لیڈروں نے اس تقریر کا جواب دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔ انصار کی تعریف میں جتنا کچھ کہا جا سکتا تھا حضرت ابوبکرؓ نے خود بہتر سے بہتر لفظوں میں کہہ دیا تھا اور ساتھ ہی اپنے نقطۂ نظر کو ایسے مدلل طریق پر اور ایسے غیر متزلزل لب و لہجہ میں پیش کر دیا تھا کہ کسی غلط امید کے لیے کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تقریر سے اکثریت کا ذہن صاف ہو چکا ہے اور اب لوگ ان کی رہنمائی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں تو انہوں نے ایک بہترین سیاسی لیڈر کی طرح صحیح موقع سے صحیح فائدہ اٹھایا، اور حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہیں۔ ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو قبل اس کے کہ ان کا یا حضرت ابوعبیدہؓ کا نام زیر بحث آئے فوراً سبقت کر کے حضرت ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ

ہاتھ لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ مسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے منتخب کیا۔ اس وجہ سے آپ ہی سزاوار ہیں کہ مسلمانوں کے خلیفہ بنیں۔ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے درحقیقت اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں گے جو ان تمام لوگوں میں بہترین ہیں، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی۔" اسی طرح حضرت ابو عبیدہؓ بھی آگے بڑھے اور حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے بولے: "آپ تمام مہاجرین میں سب سے افضل ہیں۔ آپ غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تنہا ساتھی تھے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے فریضۂ دینی نماز کے قیام و اہتمام میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں، تو آپ کے ہوتے ہوئے بھلا اس منصب کا سزاوار آپ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" مہاجرین کے دو چوٹی کے لیڈروں نے جن پر اس منصب کے لیے نگاہ پڑ سکتی تھی، مذکورہ بالا الفاظ میں صرف اپنے ہی جذبات کا اظہار نہیں کیا، بلکہ پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کر دی اور اس شخص کی طرف انگلی اٹھا کے اشارہ کر دیا جو پوری قوم کے اندر منصب خلافت کی ذمہ داریوں کے لیے بہترین شخص تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب محسوس کر لیا کہ لوگ یہ ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ڈالنے کے لیے مصر ہیں تو باوجودیکہ ان سے زیادہ اس قسم کے عہدوں سے بھاگنے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، لیکن انہوں نے قبول کر لیا۔ ان کی آمادگی کے ظاہر ہوتے ہی تمام انصار، بجز سعد بن عبادہؓ کے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے اس جوش و خروش کے ساتھ بڑھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ریل پیل میں سعد بن عبادہؓ روندے جائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر اپنے سیاسی عزم و حزم کا جو ثبوت دیا اس کے بیان کے لیے میں مصر کے مشہور مورخ، محمد حسنین ہیکل کے مندرجہ ذیل الفاظ مستعار لے لیتا ہوں وہ فرماتے ہیں: "اس میں شبہ نہیں کہ یہ اجتماع اسلام کی زندگی میں ایک نہایت اہم اجتماع تھا اور اگر حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر غیر معمولی عزم و حزم کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو اندیشہ تھا کہ اس نئے دین کے خلاف خود اس کے گہوارے کے اندر بھی اس طرح کی بغاوت پھوٹ پڑے جس طرح کی بغاوت عرب کے دوسرے مقامات سے پھوٹ پڑی تھی اور یہ بغاوت ایسے وقت میں پھوٹتی جب کہ پیغمبر اسلام کی نعش مبارک ابھی سپرد خاک بھی نہ ہوئی ہوتی۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کی اہلیت:

حضرت ابوبکرؓ کو جس شخص کی جانشینی ملی تھی وہ کوئی عام انسان نہ تھا، بلکہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر تھا۔ اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعے سے اس کی رہنمائی کرتا تھا، فرشتوں کے ذریعے سے اس کی مدد فرماتا اور معجزات کے ذریعے سے اس کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ آپ کے اخلاق و اوصاف تمام تر براہ راست اللہ تعالیٰ کی تربیت میں نشو و نما پاتے تھے۔ اس وجہ سے کسی پہلو سے

ان میں کوئی نقص نہ تھا بلکہ وہ کمال کے آخری درجہ پر تھے۔ جہاں پیش رو اتنا شاندار اور عظیم شان ہو، نہ ثقہ بات ہے کہ وہاں اس کے جانشین کے لیے اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کوئی سہل بات نہیں ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں نبی کا کمال سمایا ہوا ہو وہ اس کے جانشین کو کتنی ہی فیاضانہ رعایت دے کر جانچیں تاہم ان کی جانچ کا معیار اتنا اونچا ہوگا کہ اس معیار پر پورا اترنا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ بالخصوص جب کہ جانچنے والے خود بھی بلند سے بلند معیار پر پورے اترنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک ایسے ہی بلند مرتبہ اور عالی مقام پیشرو کی جگہ سنبھالی تھی اور اپنے پہلے خطبے میں برملا لوگوں کو بتا دیا تھا کہ میں کس کا جانشین ہوں اور مجھے اپنے آپ کو کس کسوٹی پر جچوانا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے: "اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ پس اگر میں ٹھیک کام کروں تو آپ میری مدد کیجیے اور اگر غلط کروں تو مجھے درست کر دیجیے ...... آپ کے اندر سب سے بے اثر لوگ میرے نزدیک بااثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کے حق کو غاصبوں سے وصول کروں اور بااثر لوگ میرے نزدیک بے اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا ہڑپ کیا ہوا حق وصول کروں ..... میں جب تک اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں اس وقت تک آپ میری اطاعت کریں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو پھر آپ پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اس خطبہ میں اپنی حکومت کا مقصد بھی بیان کر دیا تھا، اپنے حدود عمل بھی مقرر کر دیے تھے اور اس امر کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ اپنے حدود عمل سے ذرا بھی تجاوز کریں تو لوگوں کو ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ خود یہ حقیقت لوگوں کے سامنے رکھ دی تھی کہ وہ ایک اسلامی حکومت کے امیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے کے لیے ذمہ دار ہیں اور ان کی اطاعت مسلمانوں پر صرف اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے طریقہ پر چلتے رہیں، جہاں وہ اس سے ذرا بھی منحرف ہوں لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کو اٹھا کر پھینک دیں۔ دنیا کے ایک عظیم ترین پیغمبر کی جانشینی کی ذمہ داری اٹھانا اور لوگوں کو یہ حق دے دینا کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کی روشنی میں ان کے قول و عمل کا محاسبہ کرتے رہیں کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بالخصوص ایسے لوگوں کو یہ حق دینا جو رسول کے علم و عمل سے اچھی طرح واقف بھی ہوں اور کسی بڑے سے بڑے شخص کا محاسبہ کرنے کی ہمت اور قابلیت بھی رکھتے ہوں، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ ہمت کر کے دکھا دی اور تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے پیغمبر کی جانشینی کا حق اسی طرح ادا کیا جس طرح اس کے ادا کرنے کا حق تھا۔ یہاں تک کہ ان کے عہد کے ایک دوسرے بڑے آدمی نے ـــــ جس سے بڑا حضرت ابوبکرؓ کے سوا کوئی اور نہ تھا ـــــ

ان کی بعض عظیم خدمات سے متاثر ہو کر نہایت حسرت کے انداز میں یہ کہا کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا معیار یہی ہے جو آپ نے قائم کر دیا ہے تو آپ کے جانشینوں میں سے کون ہے جو آپ کی ہمسری کا حوصلہ کر سکے گا!

حکمرانی کی قابلیت :

حضرت ابوبکرؓ جس وقت خلیفہ ہوئے ہیں کسی بنی بنائی حکومت کے خلیفہ نہیں ہوئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نبوت کے دور کے بعد اسلامی حکومت کا آغاز ان کی ذات سے ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے وہ ساری مشکلیں موجود تھیں جو ایک نئی حکومت کے آغاز کار میں موجود ہوا کرتی ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہونا ہر تخت نشین کا کام نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستیاں ان مشکلات پر قابو پاتی ہیں جو خدا کے ہاں سے حکمرانی کی خاص قابلیت لے کر آتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے اندر اسی طرح کی قابلیت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی حکومت کی داخلی اور خارجی مشکلات پر جس خوبی کے ساتھ قابو پایا اس کی مثال حکمرانی کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔ اس مختصر مضمون میں اس عنوان پر زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ ہم بعض باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ ناظرین سے امید ہے کہ وہ ان اشارات کی روشنی میں اصل حقیقت کو اس کے تفصیلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا انصار پر جو ردِ عمل ہوا اور حضرت ابوبکرؓ نے جس تدبر اور حزم کے ساتھ حالات پر قابو پایا اس کی طرف ہم اوپر مختصراً اشارہ کر چکے ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو جانے کے بعد اگرچہ انصار کے لیڈر، سعد بن عبادہؓ نے نہ تو حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور نہ جمعہ و جماعت اور حج اور دوسرے اجتماعی امور میں ان کی امارت تسلیم کرتے رہتے تھے بلکہ ان کے رویہ سے اس بات کا نہایت قوی اندیشہ تھا کہ اگر کچھ لوگ ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تو وہ ملک میں بغاوت برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہونے سے پہلے تک انصار پر سعد بن عبادہؓ کا جو زور و اثر تھا حضرت ابوبکرؓ اس سے ناواقف نہیں تھے اور وہ عربی قوم کی اس افتادِ مزاج سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کے اندر کسی معمولی سی تحریک سے پرانے خوابیدہ فتنے بڑی آسانی سے جاگ اٹھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو سعدؓ کو چھوڑے رکھنے کے خطروں سے آگاہ بھی کیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ اگر سعدؓ سے تعرض کیا گیا تو انصار کے اندر ان کی حمایت کے لیے عصبیت پیدا ہوگی

جس کے نتائج حکومت کے لیے مضر ہو سکتے ہیں اور اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان کے سایہ کے سوا کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہیں نکلے گا اور کچھ دنوں کے بعد یا تو حکومت کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر وہ خود بدل جائیں گے اور اگر خدانخواستہ وہ نہ بدلے تو حالات میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلا سکیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جس وقت یہ اندازہ لگایا تھا اس وقت مختلف وجوہ کی بنا پر اس اندازہ کو غلط ٹھہرایا جا سکتا تھا لیکن پیش آنے والے حالات نے ثابت کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو رائے قائم کی تھی وہ بالکل صحیح تھی اور اگر وہ اس کے خلاف کوئی اور پالیسی اختیار کرتے تو شاید اس کے نتائج اچھے نہ نکلتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگوں کے ذہن میں بھی حضرت ابوبکرؓ اور ان کی حکومت کے خلاف بعض غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ان غلط فہمیوں نے نہایت سخت سیاسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ خانوادۂ رسول کے ساتھ مسلمانوں کو ایک جذباتی تعلق تھا، اور یہ تعلق جتنا عام مسلمانوں کو تھا اس سے کہیں زیادہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو تھا۔ لیکن ان تمام واقعات سے بالاتر وہ حق تھا جس کی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری ان کے سر ڈالی گئی تھی اور جس کے لیے وہ عند الناس اور عند اللہ، دونوں جگہ جواب دہ تھے۔ اس دوگونہ کشمکش کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کو خانوادۂ رسول کے معاملہ کی وجہ سے ذہنی و قلبی پریشانی لاحق ہوئی، ان کے لیے نہ یہ ممکن تھا کہ وہ حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ جیسے لوگوں کے ساتھ وہ روک معاملہ کریں جو سیاست کا تقاضا ہے، کیونکہ ایسا کرنا مسلمانوں کے جذبات کے بھی خلاف تھا اور خود ان کے جذبات کے بھی خلاف تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ خلافت وغیرہ کے معاملہ میں ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کریں۔ کیونکہ اس معاملہ میں وہ ان لوگوں کی رائے کو شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس معاملہ کا ایک خطرناک پہلو یہ تھا کہ خانوادۂ رسول کے بعض ممتاز ارکان کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تاخیر ہو رہی تھی جس کے سبب سے حکومت کی دھاک بھی خطرہ میں تھی اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ مبادا چھپے ہوئے اہل غرض اس چنگاری کو ہوا دے کر کوئی فتنہ کھڑا کریں۔ یہ سارے اندیشے اور خطرات موجود تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے نہ تو کوئی بات جذبات کے خلاف کی اور نہ بال برابر اس رائے سے ہٹنے پر راضی ہوئے جس کو از روئے شرع صحیح سمجھتے تھے۔ اس معاملہ کا اگر کوئی پہلو قابلِ اطمینان تھا تو یہ تھا کہ اس نزاع میں بھی بنو ہاشم کے لیڈر حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ جن کی نسبت یہ اعتماد تھا کہ وہ کسی معاملہ میں اختلاف تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی اختلاف کو فتنہ بنانے کی کوشش کرنا ان کی شان اور مرتبہ کے خلاف ہے۔ غالباً اس اعتماد پر حضرت ابوبکرؓ نے اس معاملہ میں انتہائی رواداری کی پالیسی اختیار کی اور ان کی یہ پالیسی سو فیصد کامیاب رہی۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی ہے تو ملک کے اندر کے حالات بھی انتہائی حد تک گڑبڑ گڑبڑ تھے اور باہر سے رومیوں کے حملے کا اندیشہ بھی ہر وقت موجود تھا۔ اندرونِ ملک کی حالت یہ تھی کہ ان قبائل کے سوا جو مکہ، مدینہ اور طائف کے درمیان تھے، باقی تقریباً سارا عرب ارتداد کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا۔ مدینہ کے قریب کے بہت سے قبائل، مثلاً ذبیان، بنی کنانہ، غطفان اور فزارہ وغیرہ نے اگرچہ اپنے ارتداد کا اعلان نہیں کیا، لیکن مدینہ کی مرکزی حکومت سے بے تعلقی اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ نبوت کے مدعی اور ملک و مال کے طالب اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے بہتوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ بنی امیہ میں طلیحہ، بنی تمیم میں سجاح، یمامہ کے مسیلمہ وغیرہ نے نبوت کے دعوے کر دیے۔ یمن میں اسود عنسی نے علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک خلقِ کثیر نے اس کا ساتھ دیا۔

دوسری طرف غزوۂ تبوک اور غزوہ موتہ کی وجہ سے مسلمانوں اور رومیوں میں ایک مسلسل جنگ کی حالت قائم ہو چکی تھی۔ رومیوں کی طرف سے حملہ کا خطرہ یوں تو پہلے ہی سے موجود تھا، لیکن غزوہ موتہ کے موقع پر مسلمانوں نے جو پسپائی اختیار کی تھی اس کے سبب سے ان کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے اور اندیشہ تھا کہ اگر ان کو یہ پتہ چل گیا کہ مدینہ کی حکومت داخلی مشکلات میں گھر گئی ہے اور ملک کے بڑے حصہ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے تو وہ فوراً مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ یہ دونوں خطرے پہلے سے موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کی زمام سنبھالتے ہی ان دونوں خطروں سے نمٹنا تھا۔ اب دیکھیے کہ انہوں نے ان خطروں کا بیک وقت کس عزم و ہمت اور کس غیر معمولی تدبیر و تدبر کے ساتھ مقابلہ کیا اور کس طرح دونوں خطروں پر فتح پائی۔

سب سے پہلے تو انہوں نے خلیفہ ہوتے ہی اس لشکر کو رومیوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی میں حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو چکا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور پھر آپ کی وفات کے سبب سے اس کی روانگی میں تاخیر ہو گئی تھی۔ آپ کے اس حکم کو اکابر صحابہؓ نے مناسب نہ سمجھا اور آپ کو لشکر بھیجنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بعض لوگوں نے تو اس دلیل کی بنا پر آپ کو روکا کہ ملک کے اندرونی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسے حالات کے اندر تمام بڑے بڑے صحابہؓ کا لشکر کے ساتھ ملک سے باہر چلے جانا خلافِ مصلحت ہے اور کچھ لوگوں نے اس سبب سے کہ ان کو حضرت اسامہؓ کی قیادت پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ جس فوج کے اندر نہایت جلیل القدر اور معمر صحابہ موجود ہیں اس فوج کی قیادت ایک نوخیز اور ناتجربہ کار کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں اعتراضوں میں سے کوئی ایک اعتراض بھی تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے میں اس کو نہیں کھولوں گا۔ بالآخر لوگوں نے حضرت عمرؓ کو ذریعہ بنایا اور ان کے واسطہ

سے حضرت ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ اول تو ملک کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر فوج کی روانگی فی الحال ملتوی کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم اسامہؓ کو قیادت سے ہٹا کر کسی بڑے صحابی کو امیرِ عسکر بنایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جس وقت حضرت ابوبکرؓ کے سامنے لوگوں کی یہ درخواست رکھی تو انہوں نے اس کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ دیا کہ اگر مجھے کتے اور بھیڑیے بھی اُچک لے جائیں تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی سکیم کو مسترد نہیں کروں گا اور دوسرے حصے کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی اور فرمایا "اے ابن خطاب! تمہاری ماں تم کو روئے۔ جس کو نبی نے مقرر کیا تم مشورہ دیتے ہو کہ میں اس کو معزول کر دوں؟"

الغرض ان تمام مخالفتوں اور حالات کی گڑبڑی کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ کے لشکر کو بھیج دیا اور یہ ان کے عزم کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس فوج کو نہایت شاندار فتح نصیب کی اور اس فتح نے اندر کے دشمنوں کو بھی مرعوب کر دیا اور بیرونی دشمنوں کے حوصلوں کی بھی کمر توڑ دی۔ عرب کے جو قبائل بغاوت کے لیے پر تول رہے تھے جب ان کو پتہ چلا کہ لشکرِ گراں رومیوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہو رہا ہے ان میں یہ چرچا پھیلنے لگا کہ مدینہ کی حکومت کے پاس کافی طاقت موجود نہ ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنے دور دراز ملک پر فوج کشی کا ارادہ کرتی اور اس چیز نے ان کے بغاوت کے حوصلہ کو اور بھی سرد کر دیا۔ دوسری طرف ہرقل کو خود اپنی سرحدوں کی حفاظت کی پڑ گئی چہ جائیکہ وہ عرب پر حملہ آور ہونے کی جرأت کرتا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے ایک پتھر سے دو شکار کرنے چاہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی سکیم میں کامیاب رہے۔

بیرونی خطرے کے سدِباب کے لیے مذکورہ بالا انتظام کر دینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے پوری طاقت کے ذریعہ سے اندرونی بغاوت کو بھی دبا دینے کا نہایت مضبوط ارادہ کیا۔ اس سلسلہ میں بھی صحابہ کی جماعت کی طرف سے، جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت کی۔ کم از کم مانعینِ زکوٰۃ کے بارہ میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سے جنگ نہ کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ انہوں نے مرکزی خزانہ کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے، اپنے جان و مال کی حفاظت سے محروم نہیں کیے جا سکتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا انہوں نے فرمایا کہ اسلام میں زکوٰۃ نماز کے ہم پایہ ہے، اس وجہ سے اگر نماز کے لیے جنگ کی جا سکتی ہے تو زکوٰۃ کے لیے بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنی رائے پر کچھ اصرار کرنا چاہا تو حضرت ابوبکرؓ نے نہایت سختی سے ڈانٹا کہ جاہلیت کے دور میں آپ بہادر تھے۔ اب اسلام کے دور میں آپ بزدلی دکھا رہے ہیں اور پھر پورے جوش عزم کے ساتھ فرمایا "اگر کوئی بھی میرے ساتھ نہیں نکلے گا تو میں تنہا ان سے جنگ کے لیے نکلوں گا۔" ان کے اس عزم نے سب کے دلوں میں حرارت پیدا کر دی اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر حضرت ابوبکرؓ نے

بغاوت کا قلع قمع کر دیا۔ اس سلسلہ کی یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ باوجودیکہ بغاوت کا دائرہ نہایت وسیع تھا، مدینہ کی حکومت گونا گوں مشکلات کے اندر گھری ہوئی تھی اور صحابہؓ کی جماعت پورے زور کے ساتھ اس بات کی حامی تھی کہ باغیوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے، ان سے جنگ نہ کی جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سمجھوتے کی ساری تجویزوں کو رد کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اسلام کے مقرر کیے ہوئے حقوق میں سے بکری کا ایک بچہ بھی میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

غور کیجیے کہ اگر اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اس عزم کا ثبوت نہ دیا ہوتا، بلکہ بڑھتی ہوئی بغاوت سے مرعوب ہو کر مرتدین اور باغیوں سے سمجھوتہ منظور کر لیا ہوتا تو عرب کی تاریخ، بلکہ خود اسلام کی تاریخ اس سے کتنی مختلف ہوتی جو آج اس کی تاریخ ہے۔ اسی طرح اگر حضرت اسامہؓ کے لشکر کی روانگی لوگوں کی مخالفت سے متاثر ہو کر حضرت ابوبکرؓ نے ملتوی کر دی ہوتی تو اندر اور باہر کے کتنے خطرے تھے جو ان کی اس کمزوری سے سر پا سکتے تھے لیکن سخت سے سخت حالات کے اندر حضرت ابوبکرؓ نے وہی فیصلہ کیا جو عزم اور تدبر کا حقیقی تقاضا تھا اور یہ ان کے اسی عزم کا ثمرہ تھا کہ سوا دو سال سے بھی کم کی مدت میں انہوں نے نہ صرف عرب کو اسلام کی طاقت کے آگے سرنگوں کر دیا، بلکہ عراق کی تسخیر سے فارغ ہو کر ان کی فوجوں نے شام پر حملے کر دیے۔